التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۶، شمارہ ۱۸، ۱۹ اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

مولانا عبد الرؤف دانا پوری بطور سیرت نگار (بحوالہ اصح السیر)

ڈاکٹر محمد ادریس لودھی

Maulana Abdur Rauf Dana puri was hailed as one of the distinctive and well-known Seerah writer of Indo-Pak Sub Continent of his times. His book titled "Asah -ul-Sear" ranked as outstanding in the cluster of seerah books. His book comprised of authentic sources and the accurate narration of various incidents of seerah . The author has paid special attention in description of Ghazwas of prophet of Islam. He has also tried to give appropriate status in integration of narration and contents. In his book, Maulana Dana Puri has analyzed the information related to narration and contents in the light of logic and rationality. He also deduced the principle of jurisprudence from the event s of seerah. Instead of

embroiling in discourse of submitting rejoinder in connection with objections raised by orientalists, his supreme focus was on the collection and analysis of seerah data in well researched and integrated manner. This seerah book comprised of such attributes which has been unprecedented in the history of seerah writing of sub continent. Moreover, Mualana Abdur Rauf has also described the incidents of seerah with exact dates of their happenings; it may be termed as the dominating feature of his book. The last but not the least, the author has assembled all the information pertaining to early life as well as pre and post Nabbvi era of Hazrat Muhammad (SAW)

خطہ ہند تاریخ میں مختلف نسلوں تہذیبوں اور مذاہب کا مرکز رہا ہے یہاں پہنچنے والا آخری قافلہ اسلامی تہذیب کا تھا یہ تہذیب صنم خانہ ہند کے تیرہ و تاریک ماحول میں مینارۂ نور تھی اس سرزمین میں ایسی معتبر و متبحر شخصیات پیدا ہوئیں کہ جن سے ہزاروں دریاؤں نے روانی سیکھی۔ ان نابغہ ہائے ہند میں مولانا ابو البرکات حکیم عبد الروف داناپوری کی شخصیت علم و فضل، زہد وتقویٰ اور خصوصاً سیرت نگاری کے حوالے سے نہایت مکرم ومحترم تھی۔ آپ کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں خاندان کے دینی ماحول اور اس کے محرکات و موثرات کا اہم دخل تھا۔ آپ کی تبحر علمی بصیرت اور ژرف نگاہی پر اصح السیر کا ہر صفحہ گواہ ہے۔مولانا دانا پوری صاحب برصغیر کے نامور سیرت نگار تھے۔آپ کا تعلق صوبہ بہار کے شہر دانا پور سے تھا جو پٹنہ کے قریب ہے اسی علاقائی مناسبت سے آپ دانا پوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ (1)

ولادت، حصول علم اور صفات و کمالات

مولانا دانا پوری پٹنہ میں 1873ء میں پیدا ہوئے والد صاحب کا نام عبد القادر تھا جو

بڑے فاضل انسان تھے۔مولانا عبدالرؤف نے دانا پور، آگرہ اور لکھنؤ سے تعلیم حاصل کی۔ آپ نہایت ماہر طبیب اور معالج بھی تھے کلکتہ کی انجمن اطباء کے صدر تھے(2)۔ سادہ مزاج متواضع اور خلیق انسان تھے گویا آپ مسلمانوں کے روحانی اور جسمانی طبیب تھے۔

آپ خوش بیان خطیب ومقرر بھی تھے آپ کے اکثر خطبات امت مسلمہ کے زوال کے اسباب احیاء امت کے تخ اور برطانوی سامراج کے خلاف اعلائے کلمۃ الحق پر مشتمل ہوتے تھے اپنی حق گوئی اور بے باکی کی بدولت 1916ء میں گرفتار ہوئے(3)۔ آپ جید اور عظیم حنفی عالم اور مؤرخ تھے ۔ بقول مولانا شاہ معین الدین ندوی تذکرہ میں مولانا دانا پوری صاحب کا معتدل اسلوب تھا فقہی اقوال کی تحقیق وتخریج کرتے اور مستند روایات سے استدلال کرتے تھے۔(4)

مولانا نے دور غلامی میں ہوش سنبھالا برطانوی سامراج اور مکار ہندو ل کر مسلمانوں کا ہر میدان میں استحصال کر رہے تھے مسلمان دونوں سے آزادی کے لئے برسرپیکار تھے آپ جیسے ذہین، حساس، دردمند اور صاحب ایمان شخص کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ تحریک آزادی سے الگ ہو سکے چنانچہ آپ نے تحریک آزادی میں بھی اپنا کردار ادا کیا مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری ندوی نے ہندوستان سے ہجرت کا فتویٰ جاری کیا تو مولانا دانا پوری نے اس کی حمایت کی اور ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا (5)اس دور میں آپ کا یہ عمل افضل الجهاد كلمة الحق عند سلطان جائر (6) کی حدیث کے عین مطابق تھا ۔ انہیں دینی علوم پر بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ قدیم وجدید علوم کا مرقع تھے اور ان میں تحقیق کی قدرت رکھتے تھے ، 1912میں الہلال کی ادارت میں شرکت کے موقع پر سید سلیمان ندوی سے ملاقات ہوئی اور ان سے بہت متاثر ہوئے۔

II۔اختلاف رائے کا احترام اور وفات

مذہبی مسائل اور معاملات میں آپ ہمیشہ اختلاف رائے کا احترام کرتے بڑے غیر متعصب اور ذہنی وسعت کے مالک تھے۔ سید سلیمان ندوی نے اُن کے اس فتویٰ سے اختلاف کیا کہ جس عورت کا خاوند ظلم کرے اور نفقہ نہ دے تو اس کی خلاصی کی کوئی سبیل نہیں ۔ مولانا

ندوی نے معارف کے پہلے شمارہ میں زوجہ غیر معلق علیہا کے عنوان سے مولانا دانا پوری کی رائے سے اختلاف ظاہر کیا تو مولانا دانا پوری نے فرمایا کہ یہ مضمون ایک پڑھے لکھے شخص کا ہے (7)۔ مولانا کا تعلق جمعیت علمائے کلکتہ سے بھی رہا اور جمعیت علمائے ہند کے بعض جلسوں کی صدارت بھی کی لیکن آخر میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ بنگال کی اسلامی سیاست پر بہت اثر انداز تھے۔ جامعہ ملیہ دہلی میں اسلام کے سیاسی معاشی نظام پر بڑا بصیرت افروز خطبہ دیا۔ سید سلیمان ندوی کے مطابق مولانا دانا پوری کا سیاسی تدبر بہت اعلیٰ تھا۔ ان کی سب سے اہم تصنیف ندوی صاحب کے نزدیک اصح السیر ہے۔مزاج میں تواضع اور انکساری تھی۔ قوت سامعہ کمزور تھی۔ حلقہ صحبت بہت وسیع تھا۔ 19فروری 1948ء جمعرات صبح 8بجے کے قریب علالت کا آغاز ہوا۔ اُسی رات 1بجے کلکتہ کی چونا گلی میں انتقال فرمایا(8)۔ مرحوم کی وفات سے کلکتہ کی سرزمین علم وعرفان کے نور سے محروم ہو گئی۔

III۔برصغیر میں سیرت نگاری اور اصح السیر

برصغیر میں آغاز اسلام سے لے کر ایک طویل عرصہ تک سیرت پر کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا یہاں کی علمی روایات ایک طویل عرصہ تک عقلیات اور لفظیات کے گرد گھومتی رہی ہیں لیکن ماضی کی دوصدیوں میں برصغیر کے اہل علم نے اس ساری کمی کو پورا کر دیا اور اس کوتاہی کی کماحقہ تلافی کر دی جو ابتدائی ایک ہزار سال میں ہوئی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط سے مطالعہ سیرت کی جو غیر معمولی سرگرمی برصغیر میں دیکھنے میں آئی اس کی مثالیں دنیائے اسلام میں کم ملتی ہیں۔ (9)

عبدالرؤف دانا پوری برصغیر کے نہایت معتبر اور محقق سیرت نگار تھے ۔ انہوں نے اصح السیر کے نام سے 656صفحات پر سیرت کی نہایت جامع اور تحقیق شدہ کتاب لکھی ۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1932ء میں شائع ہوئی ۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مستشرقین جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ سیرت کے مآخذ غیر مستند یا غیر معتبر ہیں، اس اعتراض سے نپٹنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جو مستند ترین مآخذ ہیں، یعنی قرآن پاک اور حدیث، ان سے کام لے کر مستشرقین کے الزامات کا جواب دینے کی کوشش کی جائے۔ لیکن شاید ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ مستشرقین کا

کام محض اعتراض کرنا ہے۔ اعتراض کے جواب سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ ایک اعتراض کا جواب دیں گے وہ دس مزید اعتراض کر دیں گے۔ آپ دس کا جواب دے دیں گے وہ بیس اعتراض اور کر دیں گے۔(10)

مولانا عبدالرؤف ابوالبرکات داناپوری نے محسوس کیا کہ مغازی کے باب میں مستشرقین نے بہت سے اعتراضات کئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے مغازی پر خاص توجہ دی اور اردو میں سیرت پر عام طور پر جتنی کتابیں ہیں ان کے مقابلہ میں مغازی پر بہت اچھی بحث اس کتاب میں ہے۔ مغازی پر اتنی جامع بحث اردو میں بہت کم کتابوں میں ملتی ہے جتنی مولانا داناپوری نے کی ہے۔ پھر مغازی سے جو سبق نکلتے ہیں یعنی الٰہیات سیرت پر بھی بہت اچھا مواد فراہم کیا ہے۔ کتاب میں الٰہیات پر بہت مستند مواد دیا ہے اور حدیث کی مستندترین کتابوں اور شرحوں سے یہ سارا مواد لیا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ وہ کلامی مسائل سے بھی بحث کرنا چاہتے تھے، یعنی نبوت معجزات، معراج پر مستشرقین کے جو اعتراضات ہیں اس کا جواب دینا چاہتے تھے۔ لیکن کتاب کی دوسری جلد لکھنے کا ان کو موقع نہیں ملا۔ ہم تک ایک ہی جلد پہنچی ہے اور وہ بہت مستند اور انتہائی معتبر کتاب ہے۔ حکیم عبدالرؤف داناپوری کو سیرت رسول ﷺ کے بنیادی منابع تک رسائی حاصل تھی اور قدرت نے انہیں ایک فقہی مزاج عطا کیا تھا اور علوم اسلامی تک براہ راست دسترس رکھتے تھے اس پر ان کی کتاب بہترین گواہ ہے اور نتائج کے صحیح استنباط کی صلاحیت کی وجہ سے "اصح السیر" اردو کتب سیرت میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام کی حامل ہے۔ (11) مصنف کا یہ دعویٰ بڑی حد تک صحیح ہے کہ "اہل علم اس کتاب میں کتاب المغازی کو جامع، مکمل اور بہترین ترتیب پر پائیں گے" شبلی کی "سیرۃ النبی ﷺ" سے قطع نظر کسی اور اردو کتاب میں غزوات کی اتنی تفصیلات نہیں ملتیں جتنی "اصح السیر" میں پائی جاتی ہیں۔

اصح السیر کی خصوصیات

1۔ کتاب کا مربوط علمی و تحقیقی مقدمہ اور مباحث

ابتدائی چوالیس صفحات پر کتاب کا نہایت ہی شاندار مقدمہ لکھا اس میں مصنف نے

سیرت کے اولین منابع، قرآن و سنت سے ابتدا کی ہے اور پھر تدوین حدیث کی تاریخی سعی کا ذکر کرتے ہوئے فن سیرۃ اور فن حدیث کے تعلق پر بحث کی ہے۔ پھر چند صفحات میں تدوین سیرت کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور بعد ازاں روایت اور عقل کی بحث کی۔ قدیم عرب کی تاریخ اور جغرافیہ کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ کا حسب نسب، پیدائش، یتیمی، رضاعت، شام کے سفر حضرت خدیجہؓ سے عقد، بعثت، نزول، وحی، سابقین اولین مسلمانوں کو تعذیب، دعوت دین، کفار کے مظالم، ہجرت حبشہ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا قبول اسلام، قریش کا مقاطعہ، عام الحزن، سفر طائف، معراج، ہجرت مدینہ، تحویل قبلہ، مواخاۃ، جہاد و قتال، مغازی و سرایا، فتح مکہ، جنگ حنین، موتہ اور تبوک وغیرہ واقعات، سلسلہ وار بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد "کتاب الاموال" کے عنوان سے رسول اللہ ﷺ کے مالی انتظامات کا بیان ہے جن میں پہلے زکوۃ غنائم وفے اور پھر جزیہ ہدایا و تحائف اموال مجبورہ اور عشر وخراج کے مباحث ہیں۔ اس کے بعد حضور ﷺ کے قاصدوں، بادشاہوں کے نام خطوط اور مدینہ میں آنے والے وفود کا ذکر ہے۔ غزوات کے بعد وفود کے بیان میں بڑی شرح و بسط سے کام لیا گیا ہے اور حجۃ الوداع کی تفصیلات فراہم کرنے میں بھی خاص محنت کی گئی ہے۔ یہیں بعض متنازعہ فیہ مسائل (غدیر خم کا خطبہ اور مسئلہ امامت) کی بحث بھی ہے۔ پھر سریہ اسامہ بن زیدؓ، آنحضرت ﷺ کی وفات اور تجہیز وتکفین کے حالات ہیں (ضمناً واقعہ قرطاس اور حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں روافض کے شبہات کا تذکرہ بھی کیا ہے) پھر آنحضرت ﷺ کے متروکات (رقم، زمین، مکانات)، لباس، سواری کے جانوروں، مویشیوں، اسلحہ، موالی (زن و مرد)، خدام، مؤذنین، ازواج مطہرات اور کنیزوں کی تفصیلات ہیں۔(12)

2۔ درایت و عقل کا موازنہ اور شبلی پر نقد

مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ فرماتے ہیں کہ مولانا شبلیؒ سے تسامح یہ ہوا ہے کہ وہ درایت اور عقل کو ایک چیز سمجھتے ہیں۔ اور درایت کو اسناد پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں اور کسی محدث کا یہ مسلک نہیں ہے۔ بلکہ صریح البطلان ہے۔ درایت کے معنی عقل نہیں ہے علم اور تجربہ کے بعد جو ملکہ حاصل ہوتا ہے اس کو درایت کہتے ہیں محدثین کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص

کو رسول اللہ ﷺ کی سیرۃ سے پوری واقفیت ہو اور اس بارہ میں جتنی روایات صحیح ہیں وہ اس کے پیش نظر ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کے وقت کے واقعات اور حالات پر عبور رکھتا ہو ایسے شخص کو ایک طرح کی معرفت اور بصیرت حاصل ہو جائے گی۔ اسی کو درایت کہتے ہیں۔ایسے شخص کے سامنے جب کوئی روایت آئے گی اور اس کی سند نہ معلوم ہو تو وہ اپنی اسی بصیرت کی بنا پر کہہ سکے گا کہ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی ہو سکتی ہے یا نہیں۔(13)

آپ پیش لفظ میں لکھتے ہیں ”اردو میں سیرت پر اب تک بہتر کتاب صرف ایک ہی لکھی گئی ہے،یعنی مولانا شبلی کی سیرت النبی ﷺ،مگر انہوں نے مغازی پر جو کچھ لکھا ہے، بادل ناخواستہ !اس میں جو کچھ خامیاں ہیں اہل علم سے مخفی نہیں ہیں۔ خصوصاً غزوۂ بدر کے حالات میں تو انہوں نے عجیب وغریب جدت کی ہے۔ تمام واقعات کو پلٹ دیا ہے۔ تمام روایات صحیح کو ترک کر دیا ہے۔قرآن پاک کے مطالب ایسے لیے ہیں اور اس سے وہ باتیں پیدا کی ہیں جو اب تک کسی نے نہ کی تھیں۔مولانا کی نیت خراب نہ تھی۔ واقعات میں الٹ پھیر اور مطالب میں ردو بدل انہوں نے اس لیے کیا کہ عیسائیوں کو جواب دیا جائے اور بتایا جائے کہ غزوہ بدر اس لیے نہیں ہوا تھا کہ رسول اللہ ﷺ قریش کے قافلہ تجارت پر حملہ کرنے کی نیت سے نکلے تھے بلکہ اس لیے ہوا کہ خود قریش مدینہ پر حملہ کرنے آئے تھے“۔حکیم صاحب کا یہ اعتراض درست ہے اور غالباً اسی وجہ سے انہوں نے ”اصح السیر “ میں نہ صرف غزوہ بدر بلکہ تمام غزوات نبوی ﷺ پر بھرپور توجہ صرف کی ہے۔(14)

3۔عقل کو معیار بنانے کا غلط مفہوم

عقل کو معیار بنانے کا اگر یہ مطلب ہے کہ جو بات عقل وسمجھ سے باہر ہو اس کا انکار کر دیا جائے تو بڑی مشکل ہے معاد کی باتیں اکثر ایسی ہیں جن کا ادراک عقل نہیں کر سکتی ،حشر نشر،عذاب قبر، اعمال کا حساب وکتاب، جزا وسزا، جنت و دوزخ ایسی چیزیں ہیں جن کا ادراک صرف عقل سے نہیں ہو سکتا۔اعتقادات کی اکثر باتیں ہیں جن میں عقل کو دخل نہیں ہے۔ یہ سب باتیں انبیاء کرام کی تعلیم سے معلوم ہوئی ہیں ۔کیا ان چیزوں کا اس لیے انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ ہماری عقل میں نہیں آتیں۔(15)

بحیرہ راہب والی روایت پر شبلی نے ”سیرۃ النبی“ میں دو اعتراضات کیے تھے۔ اول یہ کہ عبد الرحمٰن بن غزوان اس کے روای ہیں جس کی نسبت اہل فن نے بے اعتباری ظاہر کی ہے اور دوم یہ کہ ابوموسیٰ اشعریؓ اس حدیث کے آخیر روای ہیں،وہ واقعہ کے وقت موجود نہ تھے اور نہ یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے یہ کس نے سنا؟ ۔حکیم عبد الرؤف دانا پوری ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عبد الرحمٰن بن غزوان مجروح روای نہیں ہیں بلکہ صحیح بخاری کے رواۃ میں سے ہیں۔ اور ابوموسیٰ اشعریؓ کے بارے میں کہتے ہیں کہ بالاتحقیق غلط بیانی ان کا قرینہ نہیں ہے۔ممکن ہے انہوں نے یہ واقعہ خود آنحضرتؐ کی زبانی سنا ہو۔ حکیم دانا پوری کے نزدیک صحابہؓ کا بیان حجت ہے (اس کا یک دلیل سے ان کا اپنا دینی مسلک بھی روشنی میں آجاتا ہے) ۔رہا نسطورا راہب کا قصہ تو وہ ابن سعد نے واقدی سے روایت کیا ہے لیکن ”شرف المصطفےٰ“ میں ابی سعید نیشا پوری نے اس سفر کا حال لکھا ہے جبکہ حضرت خدیجہؓ نے میسرہ کے ساتھ تجارت کے لئے آپ ﷺ کو شام بھیجا تھا اور وہ راہب کا ملنا بھی لکھتے ہیں۔ مگر اس دفعہ بھی راہب کا نام وہ بحیرا لکھتے ہیں۔ ابن مندہ اور ابونعیم نے حضرت ابن عباس سے ایک اور سفر کا حال لکھا ہے کہ اس میں ابوبکرؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ راہب کا نام بحیرا لکھا ہے۔ اصابہ اور اسد الغابہ دونوں میں بحیرا کا حال موجود ہے بلکہ اصابہ میں نسطورا کا حال بھی ہے۔(16)

4۔فہرست مضامین اصح السیر فی ہدی خیر البشر ﷺ

نسب رسول ﷺ،اجداد وجدات رسول ﷺ،اولاد ہاشم، اولاد عبدالمطلب ،عمات النبیؐ،والدہ ماجدہ ،ولادت اور یتیمی ،رضاعت،والدہ ماجدہ اور عبدالمطلب کا انتقال، سفر شام اور بحیرہ، دوسرا سفر، خدیجہؓ بن خویلد سے عقد، رسول اللہ ﷺ کی اولاد، قصہ تحکیم، زید بن عمر سے گفتگو، بعثت رسول ﷺ، سابقین اولین، تعذیب، آغاز دعوت اور اس کا طریقہ ، دعوت کا دوسرا دور، خواجہ ابوطالب کے پاس پہلا وفد، دوسرا وفد،خواجہ ابوطالب کا اضطراب ،کفار کا تیسرا اجتماع ،کفار کے مظالم، اشاعت اسلام ،حضور ﷺ کو ساحر مشہور کرنا ،حضرت حمزہؓ کا اسلام ،عتبہ کا حضورؐ کے پاس آنا ، کفار کا حضور کے پاس اجتماع ،کفار کا یہود سے مشورہ، استہزاء کا مشورہ قرآن پاک

کی کوشش، ابتلاء صحابہ، حبشہ کی طرف پہلی ہجرت، مراجعت و ہجرت ثانیہ، کفار کا حبشہ آدمی بھیجنا، اسلام اور عمر بن الخطاب، کفار کا تحریری معاہدہ، نزول قل یاایہا الکافرون، معاہدہ کا خاتمہ اور بنی ہاشم کا باہر آنا، حضرت طفیل دوسی کا اسلام، قصہ اراشی، رکانہ سے مصارعت، نجران کے عیسائی، آپؐ کے پڑوسی وہم جوار، عام الحزن، طائف کا سفر، لیلۃ المعراج، تبلیغ میں سعی و کوشش، مقدمہ ہجرت، عقبہ ثالثہ، صحابہ کی ہجرت، دارالندوہ کا مشورہ، ہجرت کا حکم اور ہجرت نبویؐ، عیال رسول اللہ ﷺ، قباء، مواخات اور تنظیم، کفار و مشرکین مدینہ، حکم جہاد و قتال، قبائل یہود، بنو قینقاع، بنونضیر، بنی قریظہ، کفار کے ساتھ معاملہ، منافقین، مؤمنین صادق، مغازی و سرایا، غزوہ بدر سے پہلے، سریہ عبیدہ بن الحارث، سریہ سعد بن ابی وقاص، غزوہ ودان، غزوہ بواط، غزوہ سفوان، غزوہ ذی العشیرہ، سریہ عبداللہ بن جحشؓ، غزوہ بدر القتال، ابوسفیان کا انتظام، قریش کا جوش، قریش کی خبر اور مشورہ، سعد بن معاذؓ، حضرت مقدادؓ، ابوسفیان نکل گیا، قریش کی رائے میں اختلاف، ابوسفیان کی صحیح خبر مسلمانوں کو نہ ملی، قریش کے پہنچنے کی خبر، مقامی حالات اور مسلمانوں کی مستعدی، جنگ کی تمہید، حکیم بن حزام اور عتبہ، ابوجہل کی شرارت، معرکہ جنگ حضورؐ کی دعا، امیہ بن خلف، عکاشہ بن محصنؓ، حضورؐ کا اعلان ابو البختری مارا گیا، ابوجہل، کفار کی لعشوں سے خطاب، مراجعت، اصحاب بدر اور شہداء، عثمان بن عفانؓ، ابوالعاص بن الربیع، ایک جماعت جو مقتول ہوئی ہجرت نہ کرنے سے، قیدیوں سے سلوک، غزوات بدر و احد کے درمیان، غزوہ بنی سلیم، غزوہ سویق، غزوہ بنی غطفان، غزوۂ نجران، غزوۂ بنی قینقاع، قتل کعب بن اشرف، غزوۂ احد، شہداء کی تجہیز و تکفین، غسل، کفن، صلوۃ جنازہ، تدفین سریہ ابو سلمہؓ، سریہ عبداللہ بن انیسؓ، یوم الرجیع، واقعہ بیر معونہ، قنوت نازلہ قنوت فی الفجر، غزوۂ بنی النضیر، غزوۂ ذات الرقاع، بدر ثانیہ، غزوۂ دومۃ الجندل، غزوۂ بنی مصطلق کب ہوا، ام المومنین جویریہؓ، منافقین کی شرارت، قصہ افک، تیمم کے حکم کا نزول، تاریخ غزوۂ خندق، غزوۂ بنی قریظہ، قتل ابو رافع، غزوۂ بنی لحیان، سریہ نجد، غزوۂ ذی قرد، بعض سرایا، عکاشہ بن محصن، عمر، محمد بن مسلمہؓ بذی القصہ، ابی عبیدہ ابن الجراح بذی القصہ، زید بن حارثہ بنی سلیم، زید بن حارثہ بطرف بنی ثعلبہ، زید بن حارثہؓ عیص، سریہ زید بن حارثہ بہ حسمی، سریہ علی المرتضیٰؓ بہ فدک،

عبدالرحمن بن عوفؓ بدومۃ الجندل، زید بن حارثہ بوادی القری، سریہ کرز بن خالد الفہری، عکل عرینہ، صلح حدیبیہ، بیعت رضوان، گفت و شنید، الہدنہ، بعض معجزات نحر و حلق، فتح مبین، مستضعفین مکہ، غزوۂ خیبر، قلعہ نطاۃ، محمود بن مسلمہؓ، اسود راعی، ایک اعرابی، قلعہ صعب، قلعہ قموص، مرحب یہود، حضرت علیؓ کی جوانمردی، حضرت صفیہؓ کا خواب، ولیمہ اور حجاب، قلعہ زبیر، بقیہ قلعہ جات کی فتح، مخابرہ، فدک، خیبر کی اراضی کی تقسیم، مراجعت اہل حبشہ، زہر دینے کا واقعہ، حجاج بن علاط۔ اس کے بعد احکام تتمہ خیبر سے متعلق از صفحہ ۲۰۴ تا ۲۰۹ حصہ کا حکم، بعض سرایا از صفحہ ۲۱۶ تا ۲۳۱ عمرۃ القضاۃ، نکاح محرم کی فقہی بحث از صفحہ ۲۲۵ تا ۲۳۰ قصہ بنت حمزہؓ، اسلام خالد بن ولید اور عمرو بن العاص، فتح مکہ از صفحہ ۲۴۴ تا ۲۷۷ عام معافی باستثنا چند، عورتیں، حکم اراضی ومقامات مکہ، حصہ کی بقیہ بحث غزوۂ حنین واوطاس وطائف غزوۂ طائف، عاملین صدقہ کا تقرر، بعض سرایا غزوۂ تبوک وجیش العسرۃ و متعلقات، مسجد ضرار، رسولؐ اللہ کی مسجدیں، متعلق جمیع غزوات وسرایا، کتاب الاموال، زکوۃ کے احکام، غنائم کا حکم، خمس کا حکم، غیر منقولات کا حکم، فے کے اموال کا حکم، الجزیہ، ہدایا وتحائف، اموال مہجورہ، العشر والخراج، حضور ﷺ کے قاصد رسولؐ کے خطوط ملوک کے نام، صدیق اکبر کا حج، کتاب الوفود، کتاب حجۃ الوداع، غدیر خم کا خطبہ اور مسئلہ امامت، وفات رسولؐ اللہ، متروکات موالی رسول ﷺ، عورتیں، خدام، موذنین رسول ﷺ، ازواج مطہرات، حجاب یعنی پردہ شرعی، دوسری ازواج۔ ان تمام موضوعات پر پوری تحقیق، تاریخی شواہد اور روایت و درایت کے حوالوں سے منطقی ربط کے ساتھ مدلل اسلوب اختیار کیا ہے۔ (17)

5۔اصح السیر کے ماخذ

مولانا داناپوریؒ نے اپنی کتاب "اصح السیر" میں قرآن اور صحاح ستہ کے علاوہ درج ذیل کتابوں اور شخصیات کو بطور ماخذ استعمال کیا۔ ابن ہشام، ابن اثیر، ابن قیم، ابن سعد، ابن حجر، ابونعیم، ابن اسحٰق، واقدی، ابومعشر، ابن الکلبی، حمیدی، اسد الغابہ، ابن خیثمہ، موسیٰ بن عقبہ، مصعب الزبیری، عروہ، ابن البرقی، مسلمہ بن محارب، ابن ابی حاتم، بکر بن اسحٰق، ابن عائذ، قاموس طبری، ابن قتیبہ، ابن شاہین، ابن اثیر، ہمراوی موسیٰ بن عقبہ زہری، حاکم، ابن

مسند، امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، شرح سفر السعادت شیخ، ابن ہمام، دارقطنی، مولانا شاہ عبدالحق، امام محمد، امام ابوجعفر طحاوی کی شرح معانی الآثار، سفیان ثوری، علامہ شامی، حافظ ابوجعفر طحاوی، ابن امیر الحاج، ملا علی قاری، مولانا عبدالحئی، بحرالرائق، علامہ ابن قیم زادالمعاد، ترمذی شریف، بیہقی، ابن مجلز، ابن ابی فدیک، ابوجعفر رازی، عاصم بن سلیمان، امام نووی، صحیحین، اصحاب سنن، قاضی اسمٰعیل بن اسحاق، ابن حزم، مدارج النبوۃ، مواہب لدنیہ، فتح الباری، قاضی عیاض شرح مسلم، روضۃ الاحباب، معارج النبوۃ، ابن حجر عسقلانی فتح الباری، امام زہری، قتادہ، ہشام ابن عروہ، شیخ ابن حجر، ابوالاسود، حاکم و بیہقی، ابوداؤد، ابن عباس، مجاہد، حسن، ابن سیرین، عمر بن عبدالعزیز، امام اوزاعی، امام ابویوسف، ابوعبید ابن جریر، علامہ عینی، ابوثور، ابن شہاب، امام مکحول، آئمہ اربعہ، جمہور، مازری، مسند امام احمد، موطا امام مالک، ابن مندہ، عروہ بن زبیر، ابن ماجہ، نسائی، ابویعلی، امام ابوجعفر طحاوی، زبیر ابن البکار، امام الیسر محمد بن اسحاق، امام ابو حنیفہ، اسحاق بن راہویہؒ، ابن وہب، ابن حبیب، امام ابن الہمام، ضحاک، قاضی اسمٰعیل بن اسحاق، قاضی شوکانی، ابوعبید بن عبدالسلام، صاحب ہدایہ، شرح ہدایہ، محمد ابن حزم، زید بن مسلم، ابن عساکر، روافض، امام بغوی معالم التنزیل، طاؤس، وہبی، طیالسی، امام اہل السیر والمغازی والاخبار محمد بن اسحاق بن یسار، احمد بن عبدالجبار، امام اوزاعی، ابونعیم، ابوموسیٰ، امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد، خطیب، ابن تیمیہ، ابن حجر مکی، صواعق محرقہ، حافظ شمس الدین جزری، حافظ ذہبی، ابوداؤد السجستانی، ابوحاتم الرازی، بزاز، علامہ زرقانی، حافظ ابن رجب حنبلی، اسمٰعیل قاضی مطلب بن عبداللہ، ابن حطب ترمذی و بزاز، کلاباذی، سلیمان بن ابی مسلم الاحول، سعید بن جبیر، سفیان بن عیینہ، قاسم بن محمد، ابوالاسود، ابن عقیل، خوارزمی، ابویوسف، علامہ سہیلی، سلیمان التیمی، ابن عبدالبر، ثعلبی، امام رازی، قاضی بیضاوی۔

6۔حدیث و سیرت میں فرق اور اسباب ورود حدیث پر اشارات

”اصح السیر“ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ”اصحاب حدیث، دراصل تین امور کو جمع کرتے ہیں۔ (۱) رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا، (۲) رسول اللہ ﷺ نے کیا کام کیا، (۳) رسول اللہ ﷺ کے سامنے یا رسول اللہ ﷺ کے وقت میں کیا کیا گیا؟ اصحاب سیرت بھی انہیں تین

امور کو جمع کرتے ہیں، اس لیے اصل کام دونوں کا ایک ہے، مگر باوجود اس کے دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اصحاب حدیث کا مقصود بالذات احکام کو جاننا ہوتا ہے اور رسول اللہ کی ذات سے ان کی بحث ضمناً ہوتی ہے اور اصحاب سیر کا مقصود بالذات رسول اللہ ﷺ کو جاننا ہے، احکام پر ان کے ہاں بحث ضمناً ہوتی ہے۔ اس لیے محدثین کا مدار بحث یہ ہوتا ہے کہ یہ فعل یا قول رسول اللہ ﷺ کا ہے یا نہیں؟ ان کی تمام تر قوت اس تحقیق پر صرف ہوتی ہے کہ اس قول یا فعل کا انتساب رسول اللہ ﷺ کی طرف صحیح ہے یا نہیں لیکن اصحاب سیرت کو یہ بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے سوال اس کے ساتھ دو باتیں اور معلوم کرنی پڑتی ہیں، ایک یہ کہ حضور ﷺ نے کب ایسا کہا یا کیا؟ دوم یہ کہ ایسا کہنے یا کرنے کی وجہ کیا ہوئی؟ گویا اصحاب سیر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات و واقعات کا پس منظر اور اس کا شان ورود بھی بیان کرتے ہیں تاکہ واقعات کی وضاحت ہو سکے۔

اصحاب سیرۃ، حضور ﷺ کے اقوال و افعال کو مسلسل اور مربوط بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے اسباب و علل کو بھی جاننا چاہتے ہیں۔ اصحاب حدیث کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے جب صحت کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فعل رسول اللہ ﷺ کا ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کا طریقہ بن گیا گو یہ نا معلوم ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے کب، کس دن اور کس تاریخ کو ایسا کیا یا ایسا فرمایا جس کی بدولت آج کم از کم ایک لاکھ اشخاص کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے، تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ اسپرنگر ہی تھا جس نے ”اصابہ“ کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ ”نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے“۔ شبلی کہتے ہیں کہ محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروا نہیں کی۔ بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سراغ رسانیاں کیں اور ایک ایک کی پردہ دری کی۔ تحقیق کا یہ اصول، روایت کہلاتا ہے۔(18)

7۔محدثانہ اصولوں کا اطلاق اور اسلامی کتب مطبوعہ یورپ سے اجتناب

روایاتِ سیرت ،راویانِ سیرت اور کتبِ سیرت کی محدثانہ اصولوں کے مطابق تحقیق و تفتیش اور پھر ان کی استنادی بحث مولانا داناپوری نے اٹھائی ہے "مصنف نے واضح کیا ہے کہ اس نے ابن سعد کی جن روایتوں کا اپنی کتاب میں حوالہ دیا ہے انہیں محض طبقاتِ ابن سعد (مطبوعہ یورپ)(19) کے بھروسہ پر نقل نہیں کیا بلکہ اس کی صرف وہی روایتیں لی ہیں جن کو اصحابِ نقل میں سے کسی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے ۔مثلاً زادالمعاد (ابن قیم)(20)، شرح مسلم(نووی)(21)،فتح الباری شرح بخاری(ابن حجر)(22)،عمدۃ القاری شرح بخاری(عینی) (23)اصابہ،اسدالغابہ،شرح مواہب(زرقانی) ارشاد الساری شرح بخاری(قسطلانی) (24)شرح سفرالسعادۃ (عبدالحق محدث دہلوی)اور مدارج النبوۃ (25) (عبدالحق محدث دہلوی)۔اس کتاب کے مآخذات ہیں ،سیرت ابن ہشام ،زادالمعاد،صحاح ستہ،تفسیر کبیر (26)امام رازی،تفسیر معالم التنزیل بغوی،تفسیر بیضاوی اور الاتقان(سیوطی) کے نام بھی معروف ہیں ۔الفاظ کی تعریف وتصحیح میں زیادہ تر امداد نہایہ ابن اثیر اور قاموس فیروزآبادی سے لی گئی ہے ۔اور بعض مقامات پر زرقانی کی شرح مواہب، قاضی شوکانی کی نیل الاوطار ،اصابہ ،فتح الباری اور مغنی سے بھی امداد لی گئی ہے۔داناپوری اصح السیر کے صفحہ نمبر ۵ اپر لکھتے ہیں :

"طبقات ابن سعد(مطبوعہ یورپ)خود کوئی ایسی کتاب نہیں جس کی ساری روایتیں قابل قبول ہوں۔ تاہم چونکہ یہ پوری کتاب ہمیں یورپ کے واسطہ سے ملی ہے اس کے بھروسہ پر ابن سعد کا حوالہ بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کی سند متن اول کتابوں سے نہ مل جائے۔ حدیث ،سیرت اور تفسیر کی اور کتابیں بھی عیسائیوں نے چھاپی ہیں ۔ان کتابوں کی بھی کوئی سند نہیں ہے ۔اور نہ ان پر اعتماد ہے ان میں سے صرف وہی باتیں قابل قبول ہوں گی جس کی سند اور متن متداول کتب میں مل جائے"۔

8۔نبوی مالیاتی نظام پر عمدہ مباحث

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں احادیث اور فقہ کی مدد سے کتاب

الاصول کو مرتب کیا گیا ہے، کہیں کہیں سیرت کی روایات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور جن جن مقامات سے ارکان اسلام کا تعلق ہے، وہ بھی بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً حجۃ الوداع کی جزئیات کی پوری تفصیل یہاں درج ہے۔ اس کتاب کی ایک اور خوبی ہے کہ جن فقہی مسائل کا سیرت کے کسی خاص پہلو سے تعلق تھا انہیں اپنے متعلقہ مقام پر ہی حل کیا گیا ہے اور بعض اہم فقہی مسائل پر جامع، مکمل اور مبسوط ومفصل بحث کی گئی ہیں، مثلاً اراضی حرم کا حکم ، نکاح محرم کی بحث، متعہ کی بحث، قنوت نازلہ اور قنوت فجر کے مباحث، خلافت اور امامت کا مسئلہ اور پردہ شرعی کی بحث نہایت مستند اور مدلل ہے۔ (27)

9۔تعلیماتِ سیرت کا مدلل بیان اور اسرائیلیات سے اجتناب

''اصح السیر'' کے موضوعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنف نے علم سیرت کو علم فقہ سے مربوط کیا ہے۔ یعنی اس نے اپنی کتاب کو صرف آنحضرت ﷺ کے سوانحی حالات کے تذکرہ تک محدود نہیں رکھا بلکہ آپ ﷺ کی سیرت کو شریعت کی روشنی میں دیکھا ہے اور آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کو مکمل مذہب کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یوں حکیم عبد الرؤف داناپوری کی یہ کتاب حضور اکرم ﷺ کی زندگی کے مستند واقعات کا مرقع ہی نہیں بلکہ دینی معلومات کی وجہ سے کتاب ایک تحقیقی حوالہ بن گئی ہے۔ مصنف چاہتے تھے کہ قاری نہ صرف حضور ﷺ کی حیات مبارکہ کے چیدہ چیدہ واقعات سے متعارف ہو بلکہ روزمرہ زندگی میں ان شرعی امور سے بھی آگاہ ہو جو اسلام نے ایک عادلانہ معاشرہ قائم کرنے کیلئے بطور ضابطہ حیات پیش کیے ہیں۔ شاید اسی لیے حکیم داناپوری صاحب نے یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتاب بائبل یا دیگر مذاہب کی کتب مقدسہ یا غیر مسلموں کے اعتراضات کو بالکل اہمیت نہیں دی۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ دوسرے لوگ اسلام اور بانی اسلام کے متعلق کیا سوچتے اور کیا کہتے ہیں۔ ان کے پیش نظر صرف یہ بنیادی سوال ہے کہ ''حضور ﷺ کیا تھے اور آپ ﷺ نے کیا کیا؟''۔ ''اصح السیر'' اس سوال کے دوسرے جزو کی تفسیر ہے، یعنی حضور ﷺ نے کیا کیا؟ اور کس طرح کیا؟ آپ ﷺ کی ولادت پاک سے وفات تک کے مسلسل حالات کو اسی نقطہ نظر سے پیش کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مجاہدانہ اور مصلحانہ زندگی کا پورا نقشہ آئینے کی طرح ظاہر ہو جائے۔

آپ ﷺ کی حیات کے **پہلے دور** یعنی پیدائش سے نبوت تک کے حالات چونکہ صحیح روایتوں میں کم ہیں اور اس زمانہ کی بہت سی روایات معجزات کی ہیں، اس لیے مصنف نے ان مباحث کو کتاب کے جزو ثانی کے لئے اٹھا رکھا تھا جو مصنف کی وفات کی وجہ سے نہ لکھا جا سکا۔ (28)

10۔ مکی مدنی زندگی کے واقعات کا تسلسل اور ربط

تاہم موجودہ جلد میں بھی آنحضرت ﷺ کے خاندانی حالات، خانگی زندگی اور عادات و اطوار کی تھوڑی بہت تفصیلات آ گئی ہیں۔ دو امور کی طرف البتہ مصنف نے خصوصی توجہ دی ہے جو عموماً ارباب سیر و حدیث کے درمیان اختلافی رہے ہیں۔ (۱) ورقہ بن نوفل کی پیشین گوئی (۲) بحیرہ نسطور کی روایت ۔ مصنف کے مطابق "ورقہ کی پیشین گوئی بخاری کی روایات سے ثابت ہے، اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ البتہ بحیرہ کا قصہ ہے اس کو میں نے معجزہ کی حیثیت سے نہیں لکھا۔ صرف یہ دکھلانا مقصود تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کا سفر بچپن میں بھی کیا تھا۔ اس سفر کا حال تقریباً تمام اہل سیر لکھتے ہیں اور بحیرہ سے ملنے کا حال بھی لکھتے ہیں، لیکن سب سے بہتر روایت وہ ہے جو ترمذی میں ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے۔ ابن حجر اصابہ میں لکھتے ہیں کہ اس روایت کے رجال سب ثقاۃ ہیں، لیکن اس کے آخر میں ایک جملہ ہے جو بالکل لغو ہے۔ وہ یہ کہ ابوطالب نے حضور ﷺ کو واپس کیا اور ابو بکرؓ نے بلالؓ کو آپ کے ساتھ کر دیا۔ یہ لغو اس لیے ہے کہ اس وقت ابو بکرؓ خود کم سن تھے اور بلال حبشیؓ کے پاس نہ تھے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ احتمال ہے کہ راوی نے کسی اور روایت کا جملہ غلطی سے اس میں شامل کر دیا ہے۔ روایت صحیح ہے اور اس جملہ کے سوا اور کوئی بات اس اس میں قابل انکار نہیں ہے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس لفظ سے معلوم ہوا کہ بلال سے مراد حبشی موذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی اور بلال بھی ابو بکرؓ کے غلام ہوں اور باوجود کم سنی کے ابو بکرؓ بھی خواجہ ابوطالب کے ساتھ سفر میں گئے ہوں"۔(29)

آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ کا **دوسرا دور** بعثت سے ہجرت تک کا ہے۔ اس زمانہ میں رسول اللہؐ اور ان کے رفقاء کو سخت مشکلات پیش آ ئیں۔ توحید کی صدا بلند کرتے ہی پورا عرب، پورا حجاز، سارے قبائل اور خود آنحضرت ﷺ کا خاندان آپ ﷺ کا دشمن بن گیا۔ اس

زمانے کے واقعات کو صحابہؓ فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن یہ زمانہ ایسا نہ تھا کہ صحابہ کرامؓ بالا ستیعاب تمام واقعات کو جمع کرتے ۔ ہجرت حبشہ، سفر طائف اور ہجرت مدینہ مشہور واقعات تھے، اس لیے ان کا تفصیلی ذکر کتب احادیث و سیر میں بھی آتا ہے اور حکیم صاحب نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں پر مظالم کی داستانوں میں سے صرف انہیں واقعات کو منتخب کیا ہے جن پر اکثر اہل سیر کا اتفاق ہے اور جن کی سند احادیث میں بھی پائی جاتی ہے۔(30)

مصنف کے مطابق حضور ﷺ کی زندگی کا **تیسرا دور** ہجرت کے بعد سے وفات تک کا ہے۔ اس دور میں آنحضرت ﷺ نے نہ صرف اپنا دفاع کیا بلکہ توحید کی حمایت میں تلوار بھی اٹھائی۔ اس مدت کا ایک ایک واقعہ سیرت کی کتابوں میں آئینہ کی طرح روشن ہے۔ چنانچہ حکیم عبدالرؤف داناپوری نے بھی اس زمانے کے حالات بے حد تفصیل سے بیان کیے ہیں، البتہ حتی الامکان کوشش کی ہے کہ صرف وہی روایات درج ہوں جو محقق و معتبر ہیں۔ "اصح السیر" کا یہ حصہ یقیناً مہتم بالشان ہے اور مصنف کی محنت شاقہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔(31)

بحیثیت مجموعی "اصح السیر" قدیم وضع کی کتب سیرت میں اعلیٰ مقام کی حامل کتاب ہے۔ اس کے مندرجات اصح ترین روایات سے ماخوذ ہیں۔ بقول مولانا حسن مثنیٰ ندوی، "حکیم عبدالرؤف داناپوری بڑے حنفی عالم اور مورخ ہیں۔ وہ جابجا متعدل انداز سے تحقیق وتخریج کا کام لیتے ہیں اور اپنے استدلال کو روایات سے تقویت پہنچاتے ہیں"۔

11۔ موثر اور عمدہ طرز تالیف

مولانا داناپوریؒ کو قدرت نے تحریر وتصنیف کا ایک خاص سلیقہ ودیعت فرمایا تھا اور وہ اس خاص وصف میں اپنے تمام معاصرین کے درمیان ممتاز تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تصانیف میں عموماً اور اصح السیر میں خصوصاً بے ربطی ،انتشار اور بے ترتیبی کا شائبہ بھی نہیں گزرتا ۔ اصح السیر کا موازنہ اردو کی کسی بھی دوسری کتاب سیرت سے کیا جائے تو مولانا کے سلیقۂ تحریر و تصنیف کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہوا نظر آئے گا۔ داناپوری اپنی کتاب "اصح السیر "صفحہ نمبر

۲۴ ۵ء پر لکھتے ہیں:

"اسلام سے قبل دنیا کی ایک بڑی لعنت وطنیت بھی تھی۔دنیا میں جس قدر خون ریزیاں ہوئیں اس میں بہت زیادہ حصہ اسی وطنیت کا ہے۔آج بھی جتنی لڑائیاں ہو رہی ہیں وہ اسی وطنیت کی برکت ہے۔وطنیت کا بڑا غلبہ یورپ میں ہے۔اور اسی وجہ سے بہترین علم ،عقل اورفہم کے باوجود ہر وقت سارا یورپ آمادہ پیکار ہے۔اسلام نے وطنیت کی بنیاد اکھیڑ دی تھی ہر ملک میں انسان دو طرح کے ہیں۔اچھے انسان۔اور برے انسان۔تمام دنیا کے اچھے انسان ایک قوم ہیں اور برے ایک قوم"۔

ارشاد ہے ﴿کونوا عباد اللہ اخوانا۔اور فرمایا الکفر ملۃ واحدۃ﴾(32)

جدید عقلاء کو اس سے تسکین نہیں ہوتی۔کیونکہ یورپ میں قومیت کا معیار وطنیت ہی ہے۔بڑے زور شور سے یہ لعنت پھر مسلمانوں کے سر منڈھی جا رہی ہے۔جس لعنت سے دنیا نے بمشکل جزوی نجات حاصل کی تھی وہی پھر دنیا پر مسلط کی جا رہی ہے اور اس کے لیے حب الوطن من الایمان اور اسی طرح کی دوسری من گھڑت حدیثیں شائع کی جاتی ہیں۔انتہائی بے باکی سے اعلان کیا جاتا ہے کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ نے ملکی آزادی کے لیے جہاد کیا۔حالانکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو مقاتلہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کیا جائے وہی جہاد ہے۔

12۔مغازی پر اردو میں جامع کتاب

اصح السیر مغازی پر اردو میں ایک مختصر مگر جامع کتاب ہے۔مولانا عبدالروف ابوالبرکات دانا پوری نے محسوس کیا کہ مغازی کے باب میں مستشرقین نے بہت سے اعتراضات کیے ہیں۔اس لیے انھوں نے مغازی پر خاص توجہ دی اور اردو میں سیرت پر عام طور پر جتنی کتابیں ہیں ان کے مقابلے میں مغازی پر بہت اچھی بحث اس کتاب میں ہے مغازی پر اتنی جامع بحث اردو میں بہت کم کتابوں میں ملتی ہے جتنی مولانا دانا پوری نے کی ہے۔پھر مغازی سے جو سبق نکلتے ہیں یعنی کلیات سیرت پر بھی بہت اچھا مواد فراہم کیا ہے۔کتاب میں کلیات پر بہت مستند مواد دیا ہے اور حدیث کی مستند ترین کتابوں اور شرحوں سے یہ سارا مواد لیا ہے۔دوسری چیز یہ کہ وہ کلامی مسائل سے بھی بحث کرنا چاہتے تھے یعنی نبوت ،معجزات ،معراج پر

مستشرقین کے جو اعتراضات ہیں اس کا جواب دینا چاہتے تھے۔لیکن کتاب کی دوسری جلد لکھنے کا ان کو موقع نہیں ملا۔ہم تک ایک ہی جلد پہنچی ہے اور وہ بہت مستند اور انتہائی معتبر کتاب ہے۔

13۔حوالہ جات میں مکمل احتیاط

دانا پوریؒ حوالہ جات میں بہت زیادہ احتیاط کرتے ہیں۔آپ مستند ترین مآخذ قرآن اور احادیث سے معاونت لیتے ہیں ،جہاں ضرورت پڑے وہاں سیرت کے ان واقعات سے رجوع کرتے ہیں جو قرآن اور احادیث صحیحہ کے خلاف نہ ہوں۔شاہ معین الدین احمد ندوی نے دانا پوریؒ کی کتاب اصح السیر کے بارے میں فرمایا:

"بحیثیت مجموعی اصح السیر وضع قدیم کی کتب سیرت میں اعلیٰ مقام کی حامل کتاب ہے۔اس کے مندرجات اصح ترین روایت سے ماخوذ ہیں"۔**بقول حسن مثنیٰ ندوی** "حکیم عبد الروف دانا پوریؒ بڑے محقق عالم اور مورخ ہیں وہ جا بجا معتدل انداز کی تحقیق و تشریح سے کام لیتے ہیں۔اور اپنے استدلال کو روایات سے تقویت پہنچاتے ہیں"(33)

14۔قوت بیان اور ایجاز و اختصار

دانا پوریؒ کا اسلوب سیرت نگاری تحقیق و استدلال پر مبنی ہے وہ اپنی ہر بات کو تحقیقی انداز میں قاری کو سمجھاتے ہیں۔آپ کی تحریر میں مکمل خود اعتمادی ہے ،کیونکہ آپ جو کچھ لکھتے ہیں وہ قرآن اور احادیث صحیحہ کے عین مطابق ہوتا ہے۔دانا پوری سیرت کے عنوان میں اپنی ذاتی رائے پر اصرار نہیں کرتے۔ایجاز و اختصار مولانا دانا پوریؒ کی تحریروں کی بنیادی خصوصیت ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ بڑی سے بڑی بات کو مختصر سے مختصر انداز میں اس طرح بیان کیا جائے کہ قاری کا ذہن بھی فوراً مفہوم کو پا جائے۔دانا پوریؒ کو یہ فن آتا ہے ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں وہ جہان معنی پوشیدہ ہوتے ہیں جو کئی پیراگرافوں میں بھی نہیں سما سکتے۔بیان کے اختصار کے لئے وہ شاعرانہ وسیلوں سے بھی کام لیتے ہیں۔دانا پوریؒ اپنی مستند کتاب "اصح السیر "میں فرماتے ہیں کہ:

"خدا کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔اور اس کے اس انعام کا کن لفظوں میں ذکر کروں کہ آج جناب سرور دو عالم ﷺ کی سیرت کا ایک حصہ پیش کرنے کے لائق ہوا۔یہ میری

زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور میری محنت کا سب سے بڑا اندوختہ ہے اور خداوند عالم اگر قبول فرمائے تو میری نجات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔اتنی کثیر تصنیفات کے باوجود مغازی کی ترتیب اور اس کی تشکیل جس قدر مشکل ہے اس سے اہل نظر واقف ہیں، جو ترتیب مغازی کی میں نے اس کتاب میں رکھی ہے وہ اصح ترین ترتیب ہے اور اہم مواضع اختلاف کے موقع پر میں نے اس کے باوجود دلائل کی طرف اشارات بھی کر دیے ہیں۔کو طوالت کے خوف سے اکثر تفصیلی مباحث سے اجتناب کیا ہے"۔(34)

15۔مقصدیت اور تہذیبی احساس

آپ ایک صاحب مقصد ادیب تھے۔علماء حق سے تعلق رکھنے والے دانا پوری صاحب نے بھی مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔اس کے لئے سیرت نگاری کو ذریعہ بنایا آپ پکے سچے مسلمان تھے۔بین المسالک ہم آہنگی پر یقین رکھتے تھے۔اصح السیر لکھنے کا بنیادی مقصد واقعات سیرت میں سے ضعیف روایات کو صحیح اور مستند روایات سے الگ کرنا تھا تاکہ سیرت جیسے مقدس اور اہم ترین موضوع پر ایک جامع، مستند اور اعلیٰ پائے کی تحقیقی کتاب منطقی اور مؤرخانہ ترتیب سے لکھی جا سکے۔

مولانا دانا پوریؒ کی تحریر میں مشرقی مسلمان اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی جھلک نظر آتی ہے۔خاص طور پر مسلمانوں کی تہذیب کو برتر ثابت کرنے کے لیے آپؒ نے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیں۔آپ کا دور مشرقی اور مغربی تہذیب میں شدید تصادم کا دور تھا۔انگریزی تہذیب کی چمک دمک نے عام مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے عزت مآب لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔وہ اپنے ماضی کا ذکر کرتے ہوئے شرماتے تھے۔یہ دانا پوری ہی تھے جنھوں نے مسلمانوں کو احساس کمتری سے نجات دلائی۔مسلمانوں کے شاندار ماضی کو سامنے رکھا ۔مسلمانوں کو اسوۂ رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا عملی نمونہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔آپ ہمیشہ اپنے خطبات میں مسلمانوں کی ملی غیرت کو بیدار کرتے تھے اور فرماتے کہ اسلام محکومیت کے لیے نہیں بلکہ حاکمیت کے لیے آیا ہے۔اور اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے جہاد فرض ہے۔

16۔تحقیقی اسلوب

دانا پوری کی تحریروں میں ایک خاص محققانہ شان پائی جاتی ہے۔ان کی تصنیف سے ان کے مطالعہ عمیق، تحقیقی اسلوب اور علمی بصیرت کا بھرپور تاثر ملتا ہے۔انہوں نے اپنی تاریخی، تنقیدی اور ادبی تصنیفات میں اپنی تحقیقی کاوش کا حق پوری طرح ادا کیا ہے۔مولانا ایک وسیع النظر عالم دین تھے، علمی مباحث میں شرکت کرتے اور علماء کی آرا کا مطالعہ کرتے تھے۔جو ایک بیدار ذہن اور کامیاب محقق کی شخصیت کا حصہ ہوا کرتا ہے۔دانا پوری نے اپنی مشہور تصنیف "اصح السیر "میں جو کچھ بیان کیا ہے،انہوں نے حدیث کی مستند ترین کتب اور ان کی شروحات سے یہ سارا مواد لیا ہے۔اور سیرت کے واقعات امام ابن شہاب زہریؒ، عروہ بن زبیرؓ، سعید ابن المسیبؒ، علقمہ ابن وقاصؓ، عبید اللہ بن عبداللہ، امام شعبیؒ، حسن بصریؒ، امام مکحول، امام السیر والاخبار محمد بن اسحاق بن یسار، موسیٰ ابن عقبہ، واقدی محمد بن سعد اور سیرت ابن ہشام سے لیے ہیں۔

17۔کتاب کی عمدہ ترتیب

مصنف نے "اصح السیر" کی ترتیب بھی نئے انداز سے کی ہے۔ان کا خیال تھا کہ عموما اصحاب سیرت، سنین پر کتاب کو تقسیم کرتے ہیں اور ایک ایک سال میں ہر قسم کے واقعات جمع کرتے ہیں، لیکن اس طریق کار پر اکثر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، خلط مبحث بھی ہو جاتا ہے اور مباحث بھی منتشر ہو جاتے ہیں۔ایک ایک چیز کے لیے مختلف سنین میں مباحث دیکھنے پڑتے ہیں۔پھر یہ بھی ہے کہ جن مصنفین نے سنین کی پابندی کے ساتھ مباحث کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے، وہ فی الواقع سنین کی پابندی بھی نہیں کر سکے۔اسی لیے اپنی کتاب میں حکیم صاحب نے آنحضرت ﷺ کے حالات کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ کیا۔پہلے حصے میں (جو موجودہ کتاب پر مشتمل ہے) ولادت سے وفات تک حضورؐ کے حالات ہیں، لیکن یہاں وہی حالات درج کیے گئے ہیں جن کا تعلق اسلام کی تبلیغ واشاعت اور اسلامی قوت کی ترقی سے ہے۔مصنف کے نزدیک یہ حضور ﷺ (مدنی دور) کی مجاہدانہ زندگی ہے۔دوسرے حصے میں (جو لکھا نہ جا سکا) مصنف کا ارادہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی ہو، یعنی دلائل النبوۃ، معجزات، معراج، شمائل اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ نے دنیا کے سامنے کیا پیش کیا۔یعنی آپ ﷺ کی تعلیمات اور اصلاحات وغیرہ۔وہ چاہتے تھے کہ اس حصے میں ولادت سے وفات تک

آنحضرت ﷺ کے حالات شامل کیے جائیں۔ لیکن مصنف کی وفات کی وجہ سے پیغمبرانہ زندگی والا حصہ لکھا نہ جا سکا۔

خلاصہ:

مولانا عبدالرؤف دانا پوری ایک عظیم اور محقق سیرت نگار تھے آپ کی کتاب اصح السیر اپنی نوعیت اور تحقیقی معیار موضوع کی وسعت روایات و درایت کے اصولوں کی پاسداری غرض ہر اعتبار سے بڑی جامع و مانع تصنیف ہے۔ جس میں واقعات سیرت مغازی کی صحیح تاریخ کا تعین پوری احتیاط اور تحقیق اصولوں کے مطابق کیا گیا ہے۔ سیرت نگاری کی تاریخ میں ایسی بلند پایہ کتاب کا ملنا اردو زبان میں اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ خصوصاً واقعات سیرت سے فقہی مسائل کا استنباط نہایت مثالی اور وسیع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کا ہر دور ولادت، بچپن، لڑکپن، جوانی، اعلان نبوت، مکی دور، مدنی زندگی سمیت آپ کے ذاتی احوال وظروف ازواج مطہرات، غلام، کنیزیں، موالی، رشتہ دار، اسلحہ، حسن خلق غرض سیرت کا ہر پہلو اس کتاب کی زینت ہے۔

حوالہ جات

(1) سید سلیمان ندوی، "یاد رفتگاں" مجلس نشریات اسلام کراچی صفحہ 48۔ مزید دیکھو ابو الکلام شمسی، تذکرہ علماء بہار مکتبہ دہلی 1979 صفحہ 130

(2) ایضاً صفحہ 131

(3) ایضاً صفحہ 134

(4) تحقیقی مجلہ "معارف" اعظم گڑھ جلد 1 شمارہ نمبر 5 مئی 1948

(5) ایضاً

(6) مشکوٰۃ، کتاب الجہاد، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور، 1992

(7) تحقیقی مجلہ "معارف" اعظم گڑھ مئی 1948

(8) سید سلیمان ندوی، یاد رفتگاں" مجلس نشریات اسلام کراچی صفحہ 48

(9) ڈاکٹر محمود احمد غازی، محاضرات سیرت، الفیصل ناشران کتب اردو بازار لاہور صفحہ نمبر 585

(10) ایضاً صفحہ 680

(11) ایضاً صفحہ 681

(12) ملاحظہ ہوں مقدمہ اصح السیر، از مولانا عبدالرؤف دانا پوری، مجلس نشریات اسلام کراچی 2000، صفحہ 18 t14

(13) ایضاً صفحہ 21 t18

(14) ایضاً ملاحظہ ہوں متعلقہ مباحث صفحہ 23 t21

(15) ایضاً

(16) ایضاً صفحہ 22 t19

(17) ملاحظہ ہوں فہرست اصح السیر صفحہ 20 t10

(18) ملاحظہ ہوں مقدمہ اصح السیر صفحہ 09 t08، 16 t15

(19) ابن سعد، طبقات ابن سعد مطبوعہ بیروت 1997

(20) ابن قیم، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد مطبع التجارہ قاہرہ مصر 1966

(21) امام نووی، شرح مسلم دار احتفالیہ مصر 1976

(22) ابن حجر، فتح الباری شرح البخاری مکتبہ المصریہ مصر 1398ھ

(23) ایضاً اصابہ فی تمیز الصحابہ طبع قاہرہ 1378ھ

(24) "القسطلانی" احمد بن محمد، ارشاد الساری شرح البخاری، مکتبہ الازہریہ مصر بلا تاریخ

(25) عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوۃ مکتبہ العالیہ لاہور 1985

(26) امام رازی تفسیر کبیر دار الکتب مصر قاہرہ 1962

(27) عبدالرؤف دانا پوری، اصح السیر صفحہ 306 t304

(28) ایضاً صفحہ 382 t347

(29) ایضاً صفحہ 09 t07

(30) ایضاً صفحہ 43

(31) ایضاً صفحہ t65 آخر مضمون

(32) مشکوٰۃ مکتبہ رحمانیہ لاہور 1996 کتاب الادب

(33) مجلہ معارف اعظم گڑھ صفحہ 391

(34) اصح السیر مقدمہ صفحہ 04

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۹، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

ڈاکٹر محمد رفیع الدین: شخصیت اور علمی و فکری خدمات

انجینئر نوید احمد

This is an infallible and imminent truth that the rule of a Just Islamic Order will encompass the whole Earth before the Apocalypse befalls this Earth. It is inevitable that before the political domination a philosophical and ideological domination of Islam should be achieved. The assertion about philosophical and ideological domination implies the negation of all the dogmas which are the cornerstones of all systems governing the whole world today. Proving the eminence and validity of Islamic Ideology is parallel task. AllamaIqbal initiated such a task with his famous series of lectures entitled

"Reconstruction of Religious thought in Islam" and undoubtedly Dr. Raffiuddin advanced Allama's efforts further by his own writings and lectures. With undeniable facts and his unarguable reasoning the great "reasoner" has ripped to the shreds all the philosophical and doctrinal foundations of existing political systems in today's world. The consequential iniquity and exploitation under these systems were a reason by itself to assert the fallacy of their very basis, however with his strong and literate arguments he has absolutely made it crystal-clear. Furthermore Dr. Rafi-ud-deen proved his point that only Islam's philosophical thought is the only doctrine which is capable of delivering a true impartial justice. He has truly illustrated the broad canvas of human nature and the driving force behind all human actions. According to him the real motive or an incitement to human action is not instinct or selfish desire, in fact it is a desire to set or achieve higher and higher Ideal; it is a continuous quest from good to better and then to the best. Undoubtedly the highest ideal is to seek the pleasure of Allah(SWT). It is imperative that Dr.

Raffiuddin's literary contributions be brought to limelight in a wide range of literary circles for general and comprehensive discussions. The onus is on us and we must do the best we can to put forward all his work from all different dimensions, so that the whole world may benefit from it. This literary output Dr. Mohammad Rafiuddin, personality and Literal and Ideological contributions is small step in the same direction.

ڈاکٹر محمد رفیع الدین بلاشبہ بیسویں صدی عیسوی کے عظیم مفکر اور فلسفی تھے۔ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے حوالے سے اُنہوں نے فکرِ مغرب کی مرعوبیت کو ختم کرنے میں ایک اہم علمی کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ فکرِ اسلامی کو بڑے پر اعتماد اور مدلل اسلوب میں اجاگر کیا۔ وہ علامہ اقبال کے ایک فکری جانشین تھے اور اُن کے فلسفہ ' خودی کے شارح کے طور پر مشہور ہیں۔ اقبال شناسی کے اعتبار سے اُن کی کاوشوں کو علمی و فکری حلقوں میں گراں قدر پذیرائی حاصل ہوئی۔ اقبال کی طرح اُن کا تعلق بھی کشمیر سے تھا اور بلاشبہ اہلِ کشمیر کو ہمیشہ اپنے ان فرزندوں پر ناز رہے گا۔

خاندانی پس منظر:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا سلسلۂ نسب شہاب الدین غوری کے سپہ سالار اور معتمد امیر حضرت قطب الدین شاہ صاحب تک پہنچتا ہے۔ شاہ صاحب کا نسب بعض دستیاب روایات کے مطابق محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے جو حضرت علیؓ کی زوجہ حضرت خولہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ قطب شاہ تقریباً ۱۰۳۵ء میں ہرات سے آکر پشاور کے نواح میں رہائش پذیر ہوئے اور اس

کے بعد اُن کا خاندان کوہستان نمک میں پھیل گیا اور اُس نے اپنے آزاد قبیلے تشکیل دیئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ قبائل دیگر علاقوں میں پھیل گئے۔ ڈاکٹر رفیع الدین کے جدِ اعلیٰ شیخ سکندر نے ضلع گجرات میں موضع سکندر پور آباد کیا جو اُنہی کے نام سے موسوم تھا۔ یہ خاندان بعد میں کوٹ بھوانیداس (ضلع گوجرانوالہ) منتقل ہو گیا۔ اس خاندان کے اکثر بزرگ کمالات علمیہ میں یکتا، مصنف اور شاعر بے بدل تھے۔ اہلِ پنجاب نے اُن کے خرمنِ علم سے خوشہ چینی کی۔ عربی اور فارسی کی بہترین اور مستند کتابیں اُنہوں نے تصنیف کیں۔ صرف و نحو، فقہ و تصوف، فلسفہ و تفسیر میں وہ وہ موتی بکھیرے کہ جن کی چمک سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ یہ مقولہ اب تک مشہور ہے کہ "کوٹ بھوانیداس دا بغداد ہے پنجاب دا"۔(۱)

علماء و فضلاء کے اس خاندان میں سے مولوی عبداللہ المعروف حضرت مولانا غلام رسول (۱۲۲۸ھ تا ۱۲۹۱ھ) کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہ جید عالم، مبلغ اور شاعر تھے۔ آپ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے پڑدادا مولوی غلام محمد کے بھائی تھے بلکہ اُن کی ایک صاحبزادی بھی مولوی غلام رسول کی بہو تھیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ مولوی غلام رسولؒ، ڈاکٹر رفیع الدین کے والد مولوی فقیر اللہ کے نانا تھے۔ مولوی غلام رسولؒ نے علومِ معرفت اور تبلیغِ دین کے ساتھ ساتھ پنجابی شعر و ادب میں بھی خصوصی نام پیدا کیا۔ پنجابی زبان و ادب کی ہر قابلِ ذکر تاریخ میں اُن کا تذکرہ، اُن کے نمونۂ کلام کے ساتھ موجود ہے۔ عبدالغفور قریشی نے "پنجابی ادب دی کہانی" میں نہ صرف مولانا غلام رسول کے پنجابی کلام کے نمونے درج کیے ہیں بلکہ اُن کو ایک ایسا آتش نوا مبلغ بھی قرار دیا ہے جن کی زبان کی تاثیر سے بے شمار غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے تایا حضرت مولوی محمد حسنؒ بھی ایک بلند پایہ صوفی بزرگ تھے اور ریاست جموں و کشمیر کے بیشتر علاقوں میں اپنے زہد و تقویٰ کی بدولت مریدین کا ایک وسیع حلقہ رکھتے تھے۔ وہ سال میں کئی بار اپنے چھوٹے بھائی مولوی فقیر اللہ (ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے والد ماجد) کے ہمراہ جموں و کشمیر کا سفر کرتے۔ اُن کا حلقۂ ارادت وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ بڑھتا گیا اور بالآخر اُنہوں نے اپنے آبائی وطن کوٹ بھوانیداس کو خیر باد کہا اور جموں میں مستقل سکونت اختیار کر لی ۔ پھر جموں کے علاقہ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ ڈاکٹر رفیع الدین جیسے عبقری مفکر کی ۲۴ جولائی ۱۹۰۴ء کو یہاں ولادت ہوئی ۔ (۲)

تعلیم :

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے میٹرک اور انٹر کی سطح تک سائنس کا مطالعہ کیا۔ بی ۔ اے میں اُن کے مضامین معاشیات اور عربی تھے۔ ایم ۔ اے عربی ادب میں کیا۔ فارسی میں آنرز کی ڈگری حاصل کی ۔ بعد میں پی ایچ ۔ ڈی (Ph.D) اور ڈی ۔ لٹ (D.Litt) کی ڈگریاں ان کو فلسفہ میں حاصل ہوئیں۔ گویا اُن کی تعلیم میں سائنس، ادب اور فلسفہ کا حسین امتزاج نظر آتا ہے ۔جدید علوم کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے بڑی گہرائی کے ساتھ قرآن پر تدبر کیا اور دیگر دینی علوم پر دسترس حاصل کی ۔ اقبال کی شاعری ، فکر او رفلسفہ سے اُن کو عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ اقبال کی فکر ہی اُن کی بیشتر تصانیف کا محرک محسوس ہوتی ہے۔ اس متنوع علمی پس منظر کی بدولت اُن کا اسلوبِ تحریر گہرا فلسفیانہ، عظیم وسعتِ فکر کا حامل اور اعلیٰ علمی سطح سے سرفراز ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے میٹرک کا امتحان ۱۹۲۰ء میں فرسٹ اور ہائی مین کے ساتھ پاس کیا ۔ ایف ۔ ایس ۔ سی اور بی ۔ اے کے بعد ۱۹۲۹ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم ۔ اے عربی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ آنرز ان پرشین کے امتحان میں بھی کامیاب ہوئے۔ بعد میں دورانِ ملازمت اُن کو ۱۹۴۹ء میں اُن کی فلسفیانہ تصنیف "Ideology of the Future" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی ، جس کے ممتحن ڈاکٹر رادھا کرشنن، پروفیسر ولیم للی اور سید ظفر الحسن مقرر ہوئے ۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اعتراف کیا کہ یہ مقالہ علمی دنیا میں ایک ٹھوس اضافہ ہے ۔ پروفیسر للی نے اس کو فرائڈ ، ایڈلر ، کارل مارکس اور میکڈوگل کے نظریات کا حتمی ابطال قرار دیا۔ سید ظفر الحسن کی رائے یہ تھی کہ آج تک فلسفہ کی کوئی کتاب اُن کی نظر سے ایسی نہیں گزری جو اسلام کے اس قدر قریب ہو۔ ۱۹۴۹ء میں پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ میں جب یہ کتاب ڈاکٹریٹ آف فلاسفی کی ڈگری کے لیے پیش ہوئی تو سنڈیکیٹ میں شامل بعض

حضرات نے اعتراض کیا کہ چونکہ ڈاکٹر صاحب فلسفہ میں ماسٹر کی ڈگری کے حامل نہیں ہیں ، اس لیے اُنہیں فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں ملنا چاہیے ۔ اُس وقت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ڈاکٹر عمر حیات ملک تھے جنہوں نے اس اعتراض کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اگر کوئی شخص فلسفہ میں ماسٹر ڈگری کا حامل ہوتے ہوئے بھی فلسفہ میں ایسی معرکۃ الآرا کتاب نہیں لکھ سکا تو ڈاکٹر صاحب کو، جنہوں نے فلسفہ میں ماسٹر ڈگری کے حامل نہ ہونے کے باوجود ایسی کتاب لکھی ہے ، ڈاکٹریٹ ضرور ملنی چاہیے ۔ یہ اُن کی ذہانت اور علمی بلندی کا ایک بہت بڑا اعتراف تھا۔ ۱۹۶۱ء میں فلسفۂ تعلیم پر آپ کی اعلیٰ پایہ کی تصنیف "First Principles of Education" شائع ہوئی ۔ اس تصنیف پر ۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو ڈی ۔ لٹ (D.Litt) کی ڈگری دی گئی۔ (۳)

ملازمت اور علمی مشاغل :

۱۹۲۹ء میں ایم ۔ اے (عربی) کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد آپ کا تقرر بحیثیت پروفیسر عربی اور اردو، سری پرتاب سنگھ کالج ، سری نگر میں ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں آپ کو پرنس آف ویلز کالج ، جموں میں پروفیسر عربی اور فارسی مقرر کیا گیا جہاں آپ ۱۹۴۶ء تک اپنے فرائض ادا کرتے رہے ۔ پرنس آف ویلز کالج جموں ، جہاں آپ نے اپنی ملازمت کا تقریباً ۱۴ سال کا عرصہ گزارا، آپ کے لیے کئی لحاظ سے ایک اہم دور تھا۔ اس دور میں آپ کو اپنی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے اظہار کا بھرپور موقع ملا۔ کالج کے اُس وقت کے پرنسپل، ایس ۔ آر سوری (سیوارام سوری) بھی ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے ۔ خاص طور پر آپ کی کلاسوں میں نظم وضبط مثالی تھا۔ آپ اپنی پروقار شخصیت اور خوش لباسی کی بدولت طلبہ میں بے حد مقبول تھے ۔ کالج کے سینئر سٹاف ممبر ہونے کی وجہ سے آپ علمی وادبی اور طلبہ کی دیگر سرگرمیوں کے انچارج بھی تھے ۔ کالج میگزین "توی" کی نگرانی بھی آپ کی ذمہ داری تھی ۔ آپ ہی کے زمانے میں قدرت اللہ شہاب اس مجلّہ کے ایڈیٹر رہے۔ قدرت اللہ شہاب اور بعد میں اُن کے چھوٹے بھائی حبیب اللہ شہاب آپ کے شاگردوں میں سے تھے ۔ قدرت اللہ شہاب "شہاب نامہ" میں لکھتے

ہیں:

"پرنس آف ویلز کالج کے چاروں سال انگریزی کا بھوت میرے سر پر بُری طرح سوار رہا۔ اگرچہ کالج میگزین "توی" کے اردو سیکشن کی ادارت میرے سپرد تھی۔ تاہم اردو تک بھی میری رسائی بزبانِ انگریزی ہی ہوتی تھی"۔(۴)

پرنس آف ویلز کالج، جس کے قیام کے دوران اُن کی عملی زندگی کا جو سب سے اہم واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ ان کی تصنیف "Ideology of the Future" کی تکمیل ہے جسے اُنہوں نے ۱۹۴۲ء میں مکمل کیا۔ مظفر حسین صاحب نے "دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد" میں اس تصنیف سے متعلق ایک واقعہ مافوق الفطرت انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ کتاب لکھنے سے پہلے خیالات کا ایک تندوتیز طوفان ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں سمٹ آیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ شدید علیل ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے اعصابی بے چینی تشخیص کی۔ انہی دنوں اُن کے ایک عزیز اُن کی بیماری کا حال سن کر اُن کے پاس جموں تشریف لائے اور ایک دن سیر کے لیے ساتھ لے گئے۔ راستے میں پہاڑوں کے ایک خوش منظر گوشہ میں ایک نہایت ہی نورانی شکل کے بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو ہدایت کی کہ وہ کتاب لکھنا شروع کر دیں۔ اس مشورہ پر اُنہوں نے سکون محسوس کیا۔ گھر آکر قلم اٹھایا تو آمد کا یہ عالم تھا کہ رہوارِ قلم روکے نہیں رکتا تھا۔ پوری کتاب تین ہفتوں میں مکمل ہو گئی اور اُنہیں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بوجھ اُن کے دل سے اتر گیا ہے۔ بیماری بھی جاتی رہی اور وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے۔(۵)

"Ideology of the Future" میں جس طرح سے مغربی مفکرین اور ماہرین نفسیات کے حوالے آئے ہیں اور اُن کے نظریات کا ابطال کیا گیا ہے، اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس تصنیف کے لیے بہت سی حوالہ جاتی کتب درکار تھیں، اُن کا غائر مطالعہ ضروری تھا، جوابی دلائل کے لیے گہرا غور و فکر لازم تھا اور پھر ترتیب و تدوین کے لیے بڑی ذہنی و عملی مشقت متقاضی تھی۔ اس کے نتیجے میں اُن کا شدید طور پر اعصابی دباؤ کا شکار ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔

"Ideology of the Future" کو ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے خرچ پر شائع کروایا۔ تقسیم ہندوستان کے وقت ہونے والے فسادات میں جہاں اور بہت کچھ برباد ہوا، وہیں اس کتاب کے جو چند سو نسخے شائع ہوئے تھے ان سے بھی چند ایک کے سوا بیشتر ضائع ہو گئے۔

۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر رفیع الدین کو سری کرن سنگھ کالج میرپور کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ چند سال پہلے قائم ہونے والے اس کالج کے تعلیمی و تنظیمی امور کے بارے میں آپ کے ذہن میں کئی منصوبے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ان پر پوری طرح سے عمل درآمد کیا جاتا، ملک تقسیم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی فسادات اور قتل و غارت کا ایک خوفناک سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہت سے دوسرے مسلمان سرکاری افسران کی طرح ڈاکٹر صاحب نے بھی پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اہل خانہ کچھ عرصہ پہلے ہی گوجرانوالہ جا چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بھی کسی نہ کسی طرح سے اپنی جان بچا کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد علمی خدمات :

ڈاکٹر رفیع الدین کو پاکستان آنے کے بعد کچھ عرصہ تک بیروزگاری اور چند دیگر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بعدازاں مغربی پاکستان کی حکومت نے نومسلم اسکالر علامہ محمد اسد (Leopold Weiss) کی نظامت میں "ادارۂ احیاءِ ملتِ اسلامیہ" قائم کیا تو ڈاکٹر صاحب، ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ اسی ادارے کی ملازمت کے دوران آپ نے "پاکستان کا مستقبل" کے عنوان سے ایک مقالہ قلمبند کیا جو ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں ادارۂ احیاءِ ملتِ اسلامیہ اپنے قیام کے مقاصد کی تکمیل سے پہلے ہی بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر بند ہو گیا اور ڈاکٹر صاحب ایک بار پھر مشکلات کا شکار ہو گئے۔(۶)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین اس کے بعد ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (Institute of Islamic Culture) سے وابستہ ہو گئے۔ اس ادارے کی بنیاد ۱۹۵۰ء میں خلیفہ عبدالحکیم نے گورنر جنرل غلام محمد کے مشورہ سے رکھی تھی اور وہی اس ادارے کے پہلے اکیڈمک ڈائریکٹر بھی

مقرر ہوئے۔انہوں نے انتھک کوششوں کے ذریعہ ادارے میں نامور علمی شخصیات کو جمع کیا جن میں ڈاکٹر رفیع الدین، مولانا مظہر الدین صدیقی خواجہ عباد اللہ اختر، مولانا محمد حنیف ندوی مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری، بشیر احمد ڈار، رئیس احمد جعفری اور شاہد حسین رزاقی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ اسکالرز تھے جنہیں وقت کے علمی و فکری رجحان، سماجی میلانات اور سیاسی صورت حال کا شعور حاصل تھا۔اس شعور کی بنیاد پر انہوں نے اپنی گراں قدر کاوشوں سے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی علمی حیثیت کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ اس کے وقار میں بھی اضافہ کیا۔مولانا محمد حنیف ندوی نے ماہنامہ المعارف کے فروری ۱۹۶۸ء کے شمارے میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے وابستہ شخصیات کی علمی حیثیت اور مہارت کا تجزیہ کرتے ہوئے رفقاء کے اس انتخاب کو حد درجہ موزوں قرار دیا۔ خاص طور پر ڈاکٹر رفیع الدین کے تذکرے میں لکھا:

> ''ڈاکٹر رفیع الدین'' آئیڈیالوجی آف دی فیوچر'' لکھ کر علمی و دینی حلقوں میں اپنا اثر رسوخ قائم کر چکے تھے۔۔۔۔انہوں نے اسلام کے تعلیمی فلسفے اور اس کے منشور و دعوت کی وضاحت کو اپنے ذمے لیا''۔(۷)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں بحیثیت ریسرچ آفیسر اعلیٰ علمی خدمات انجام دیں۔ اسی ادارے کے تحت انہوں نے'' قرآن اور علم جدید''، ''روحِ اسلام''، '' Fallacy of Marxism ''(مارکسیت کا مغالطہ) ''اسلام کا نظریۂ تعلیم ''اور کئی دوسرے مقالات تحریر کیے۔

۱۹۵۱ء میں اقبال اکادمی پاکستان کے نام سے ایک ادارہ نیم سرکاری حیثیت میں کراچی میں قائم ہوا جسے ۱۹۶۲ء میں ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے از سرِ نو منظم کیا گیا۔ جب سے یہ ادارہ ''اقبال اکادمی پاکستان'' کے نام سے لاہور میں موجودہ صورت میں مصروفِ کار ہے۔ ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کو اس ادارہ کے پہلے ڈائریکٹر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔آپ اپنی ریٹائرمنٹ تک اس ادارے کی ترقی اور فروغ کے لیے کوشاں رہے۔اسی ادارے میں رہتے ہوئے آپ نے اپنی اہم تصنیف'' Manifesto of Islam ''(منشور اسلام) مکمل کی۔ اس کے

علاوہ آپ نے فلسفۂ تعلیم پر'' First Principles of Education ''(تعلیم کے ابتدائی اصول) بھی لکھی جس پر بعد میں آپ کو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ (D.Litt) کی ڈگری دی گئی۔ ''اسلام اور سائنس'' کے عنوان سے ایک اہم مقالہ بھی شائع ہوا جس کو علمی و ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا۔آپ ہی کے دورِ نظامت میں اقبال اکادمی پاکستان کے ترجمان مجلات کے طور پر اپریل ۱۹۶۰ء میں سہ ماہی اقبال ریویو Iqbal Review (انگریزی) اور'' اقبالیات''(اردو) کا اجرا ہوا۔(۸)

ڈاکٹر رفیع الدین کو یہ احساس تھا کہ چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر اقبال پر اب تک جو کام ہوا ہے وہ نہ تو علمی معیار پر پورا اترتا ہے اور نہ ہی اُس میں اقبال کے افکار کی بھرپور تشریح و توضیح کا اہتمام نظر آتا ہے۔لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اقبال کے ساتھ اپنے تمام تر عقیدت مندانہ جذبات سے بلند ہو کر اس کے افکار کا ایک منظم اور مربوط عقلی و سائنسی تجزیہ کیا جائے جو عالمی سطح پر اقبال کی حقیقی عظمت کو سامنے لانے کا ذریعہ بن سکے۔انہوں نے ۱۹۶۰ء میں لکھے جانے والے ایک مقالے بعنوان'' Scientific Exposition of Iqbal ''میں اپنا موقف پیش کیا کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی روشنی میں جدید علوم کے جائزے پر مبنی ایک علمی منصوبے پر کام کا آغاز کیا جانا چاہیے جس کے تحت سیاسیات، تعلیمات، اخلاقیات، نفسیات اور تاریخ کے بنیادی اصولوں کو زیرِ بحث لایا جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا کہ یہ منصوبہ ملک کے نامور اہلِ علم کے تعاون سے اقبال اکادمی پاکستان جیسے ادارے کی نگرانی میں ہی موثر طور پر پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے(۹)۔مذکورہ مقاصد کے حصول کے لیے آپ نے ''اقبال ریویو ''اور''اقبالیات'' میں نہ صرف خود علمی و فکری مقالات لکھے بلکہ دیگر اہلِ علم سے بھی قلمی تعاون حاصل کیا جس سے مجلات کا ایک بلند علمی و فکری معیار قائم ہوا۔

حکومت پاکستان اور پنجاب یونیورسٹی کے اشتراک سے ۲۹ دسمبر ۱۹۵۷ء سے ۸جنوری ۱۹۵۸ء تک لاہور میں انٹرنیشنل اسلامک کولیکیم کا انعقاد بھی ایک تاریخی علمی واقعہ ہے جس میں تقریباً چالیس ممالک کے نامور سکالرز نے شرکت کی اور اسلام اور ثقافت کے حوالے

سے اپنے تحقیقی مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کو بھی بین الاقوامی اسلامی مذاکرے میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ کلوکیم دنیا میں اپنی قسم کا ایسا دوسرا علمی اجتماع تھا۔ اس سے قبل ۱۹۵۳ء میں امریکہ میں کانگریس لائبریری اور پرنسٹن یونیورسٹی کے اشتراک سے ایک کلوکیم منعقد ہو چکا تھا لیکن اپنے موضوعات کی وسعت اور نامور علمی شخصیات کی تعداد کی بدولت لاہور میں منعقدہ کلوکیم بلاشبہ بے مثال تھا۔ کلوکیم میں مسلم سکالرز کے ساتھ ساتھ دیگر ادیان اور عقائد سے تعلق رکھنے والے محققین و مستشرقین بھی شریک ہوئے جن میں شاہ محمد ارشاد، محمد موسیٰ شفیق (افغانستان)، سید عبدالحمید خطیب، شیخ احمد جمال (سعودی عرب)، سید محمد یوسف (سیلون)، محمد عبدالعزیز نصر، پروفیسر عثمان امین، محمد ابوزہرا، یحییٰ الخشاب، محمد حب اللہ، محمد عبداللہ العربی، مہدی عالم، امین علیکی، علی حسن عبدالقادر، عبدالوہاب عزام (مصر)، تنکومحمد تی اشدیقی، انور معدد، عبدالقاہر، عبدالمالک کریم (انڈونیشیا)، محمود شبابی، صادق شفق، محمد معین، سید محمد شیخ الاسلام، ابوالفضل حاذقی، صفا خلوصی (ایران)، عبدالغفور شیخ (کینیا)، نہاد القاسم شیخ محمد بہجت البیطار، عمر بہا الدین الامیری، احمد سمان، مصطفیٰ الزرقا، محمد المبارک (شام)، شیخ محمد مکمر (مراکش)، علی حبیب، کامل السید (سوڈان)، پروفیسر ڈاکٹر اسحاق موسیٰ الحسینی (فلسطین)، ڈاکٹر فاضل الجمالی، ڈاکٹر عبدالستار فوزی، ڈاکٹر مصطفیٰ جواد (عراق)، فواد کیرولا، محمد فواد میز گن (ترکی)، پروفیسر ولفریڈ کینٹ ویل سمتھ (کینیڈا)، الیگزنڈر بوسانی (اٹلی)، روڈی پیرٹ، برتھولڈ سپولر (جرمنی)، پروفیسر لوئی مائی سینون (فرانس)، بنیمن جداوزدی محمد علی چنگ چی (چین)، ڈاکٹر جی ڈبلیو جے ڈروبر، ڈاکٹر جوزف شاخت (ہالینڈ)، الحاج عبدالغفار مرکی (فلپائن)، ایملوگارشیا گومز (سپین)، جی۔ای وان۔ گرون باہم، رچرڈ ایٹنگھسین، کارلینڈ ہاکلو، رچرڈ نیلسن فرائی (امریکہ)، مس این۔کے۔ایس لیمٹسن اور برنارڈ لیوس (برطانیہ) کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ جبکہ ہمسایہ ملک بھارت سے مولانا عبدالماجد دریا بادی، ڈاکٹر میر ولی الدین اور ڈاکٹر زبیر صدیقی شریک ہوئے۔ میزبان ملک پاکستان سے ڈاکٹر محمود حسین، مظہر الدین صدیقی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، مولانا امین احسن اصلاحی، جسٹس ایس۔ اے رحمن، ڈاکٹر محمد داؤد رہبر، ڈاکٹر

اے ایچ ضیائی، ڈاکٹر فضل الرحمن، علامہ رشید ترابی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر عمر داؤد پوتا، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، علامہ غلام احمد پرویز، بیگم ریحانہ آصف اسلام، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، علامہ علاؤالدین صدیقی، پروفیسر قاضی محمد اسلم اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اسلامی ثقافت کے مختلف پہلوں پر اپنے مقالات پڑھے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے مقالے کا عنوان تھا۔

The Potential Contribution of Islam to the world Peace

جو بین الاقوامی مذاکرے کی آخری نشست میں پڑھا گیا۔ اس کا ماحصل یہ تھا کہ امن عالم کے قیام میں اسلام کا کردار اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اسلامی تعلیمات کی حقانیت اور صداقت کی بدولت ہی نسل انسانی کو ایک وحدت میں پرویا جا سکتا ہے جو مستقل اور پائیدار امن کی ضمانت ہے۔ مذاکرے میں پڑھے جانے جانے والے مقالات کو پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ۱۹۶۰ء میں

international Islamic Colloquium Papers ”

“ *(Dec 29,1957- Jan 8,1958)*

کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا(۱۰)۔ ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کے مقالہ کو اس مجموعہ میں صفحہ ۲۲۵ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۷۷ء میں جشن اقبال صدی کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اقبال چیئر کے قیام کی منظوری دی گئی۔ اس چیئر کے قیام کی تجویز ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے ڈائریکٹر اقبال اکادمی پاکستان کی حیثیت سے ۱۹۶۲ء میں پیش کی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ ہونے والی اپنی خط و کتابت میں اس مسئلے کے دیگر اہم پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی تھی۔ انہوں نے زور دیا تھا کہ اقبال کا شہر لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ جو گہرا تعلق رہا تھا اس کے پیش نظر پنجاب یونیورسٹی ہی اقبال چیئر کے لیے موزوں ترین درسگاہ ہو سکتی ہے۔ اس تجویز پر اُن کی زندگی میں تو عملدرآمد نہ ہو سکا البتہ اس سلسلے میں انہوں نے اقبال

کے ایک سچے اور پر جوش عقیدت مند کی حیثیت سے جو سعی کی وہ لائق تحسین ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین اپنی مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد ۱۰ اپریل ۱۹۶۵ء کو ڈائریکٹر اقبال اکادمی پاکستان کی حیثیت سے ریٹائر ہو گئے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کو خالصتاً تین سالہ کنٹریکٹ کی بنیاد پر اس عہدے کے لیے منتخب کیا گیا تھا لیکن آپ کی عمدہ کارکردگی کی بدولت مسلسل چار بار آپ کے کنٹریکٹ میں توسیع (Extension) کی جاتی رہی اور آپ بارہ برس تک اس منصب پر فائز رہے۔ اقبال اکادمی پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر کے طور پر آپ نے اس کو ایک فعال علمی ادارہ بنانے کے لیے جو کوششیں سرانجام دیں ان کا ہمیشہ اعتراف کیا جاتا رہے گا۔

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کا قیام؛

ڈاکٹر رفیع الدین اسلامی اقدار کو پھر سے اجاگر کرنے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب کو شرمندہ ٔ تعبیر کرنے کے حوالے سے نظام تعلیم میں اصلاحات کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔ اصول تعلیم اور بالخصوص اسلامی تعلیم ہمیشہ اُن کی تحقیق و تجسس کے اہم موضوعات رہے۔ اسی اعتبار سے ان کی سب سے اہم کاوش ''First Priciples of Education'' ہے۔ اقبال اکادمی پاکستان سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے خود کو مکمل طور پر تعلیمی مقاصد کے لیے وقف کر دیا۔ ''آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس'' کے قیام کو انہی مقاصد کے حصول کا ذریعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ادارے کے قیام سے کچھ پہلے ،مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام لکھے گئے خط میں ڈاکٹر رفیع الدین نے تفصیل سے ان مقاصد پر روشنی ڈالی ہے جن کے حصول کے لیے وہ کوشاں تھے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''جب میں نے اسلامی فلسفہ تعلیم پر اپنا ڈی۔ لٹ کا تھیسس مکمل کیا تھا تو میرا خیال تھا کہ میں نے کچھ تجاویز پیش کی ہیں جن پر ضرور عمل ہو گا لیکن میں نے دیکھا کہ ہماری قوم مغرب کی تقلید میں اتنی آگے نکل گئی ہے اور اپنے آپ کو اس قدر فراموش کر چکی ہے کہ فقط کتابوں میں بتانے سے کہ اسلام کے مقاصد کس قسم کے نظام تعلیم کا تقاضا کرتے

ہیں یا یہ کہنے سے کہ خالق عالم خدا کا تصور اور سائنس آپس میں لازم و ملزوم ہیں، کسی کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔ لہٰذا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کا ایک نمونہ عملاً پیش کر کے بتایا جائے کہ اسلامی نظام تعلیم یہ ہوتا ہے اور سائنس کی کتابوں کو نئے سرے سے لکھ کر اور پڑھا کر ثابت کیا جائے اور آنکھوں سے دکھایا جائے کہ اگر خدا کا عقیدہ سائنس کے اندر اپنے مقام پر آ جائے تو سائنس بگڑتی نہیں بلکہ سنورتی اور ترقی کرتی ہے''(۱۱)۔

۱۷ اگست ۱۹۶۶ء کو ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے اپنے چند ہم خیال رفقاء کے ساتھ سیالکوٹ میں اسلامک ایجوکیشن کانگریس کی بنیاد رکھی۔ افتتاحی اجلاس میں متفقہ طور پر پروفیسر نسیم الدین کو صدر اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کو ڈائریکٹر (اکیڈمک اینڈ ایڈمنسٹریٹو) کے طور پر منتخب کیا گیا۔ کانگریس کے ایک خصوصی اجلاس منعقدہ ۲۳ دسمبر ۱۹۶۶ء کو ایک قرارداد کے ذریعے اسلامک ایجوکیشن کانگریس کو ''آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس'' کا نام دے دیا گیا جو آج تک برقرار چلا آ رہا ہے۔

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کے قیام کا بنیادی مقصد علوم جدیدہ کی اسلامی تشکیل تھا جس کی رو سے یونیورسٹی کی سطح تک کے نصاب کو ازسرنو اس طرح سے مرتب کرنے کی ضرورت تھی کہ تصور توحید اس کا مرکز و محور قرار پائے۔ ڈاکٹر رفیع الدین نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نام ایک طویل خط میں اپنے قائم کردہ ادارے کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں(۱۲)۔ ان تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ جب تک توحید کا عقیدہ جیسا کہ قرآن حکیم نے اسے پیش کیا ہے عالم اسلام کی جدید یونیورسٹیوں کی تعلیم کا روح رواں نہ بن جائے اس وقت تک اُمت مسلمہ نہ اپنے آپ کو پا سکتی ہے اور نہ ہی دنیا میں توحید کے عقیدے کی بنا پر امن و اتحاد برپا کرنے کا عظیم الشان کردار ادا کر سکتی ہے۔ چنانچہ کچھ مخلص اور ذی حیثیت رفقا کے ساتھ مل کر All Pakistan Islamic Education Congress قائم کی گئی ہے جس کے منظور شدہ دستور کے مطابق یہ ادارہ دو مرحلوں میں اپنا کام سرانجام دے گا۔ پہلے مرحلے میں

تمام سائنسی علوم میں انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کے امتحانات کی نصابی کتابیں اس طرح سے مرتب کرے گا کہ خدا کا تصور ان کے مواد کا مرکزی خیال یا تنظیمی اصول بن جائے گا اور دوسرے مرحلے میں ان نصابات کی تدریس کے اہتمام کے لیے ایک یونیورسٹی بنائی جائے گی جس کا تعلیمی ماحول نصابی روح سے ہم آہنگ ہوگا۔کانگریس کے مقاصد کے حصول کے لیے ڈاکٹر رفیع الدین کے ذہن میں ''The Holy Quran University of Scinces'' کا ایک خاکہ بھی تھا جس پر وہ مسلسل غور و فکر کرتے رہے۔

کانگریس کے پہلے چھ اجلاس سیالکوٹ ہی میں صوفی محمد اشرف کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئے۔ البتہ ساتواں اجلاس مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۶۶ء کو ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی رہائش گاہ واقع چوبرجی پارک لاہور میں منعقد ہوا جس کے بعد سے لاہور کانگریس کا مستقل مرکز بن گیا۔دسمبر ۱۹۶۶ء کے اجلاس ہی میں ملک خدا بخش بچہ کو جو کہ اس وقت حکومت مغربی پاکستان میں وزیر تعلیم کے منصب پر فائز تھے آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ملک خدا بخش بچہ ڈاکٹر صاحب کی اعلیٰ صلاحیتوں کے معترف تھے اور جانتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب جن نظریات کا پرچار کرتے ہیں وہ محض کتابی نہیں بلکہ وہ ان کو عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں۔اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

''انہوں (ڈاکٹر رفیع الدین) نے آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کی داغ بیل ڈالی۔میرے بارے میں ان کا جو حسن ظن تھا اس کی وجہ سے انہوں نے مجھے اس کانگریس کی صدارت کی پیشکش کی اور آخر ان کے خلوص، محبت اور جذبۂ فکر و عمل نے مجھے یہ پیشکش قبول کرنے پر مجبور کر دیا''(۱۳)۔

کانگریس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا:

''کانگریس کے پروگرام میں اعلیٰ سطح پر ایک یونیورسٹی ''The Holy Quran University of Sciences'' کا قیام عمل میں لانا تھا جہاں سائنس کے طالب علموں کو اس حقیقت سے روشناس کرایا جاسکے کہ کائنات میں جو وحدت تنظیم، سلیقہ، حسن

ہم آہنگی اور نظم و نسق پایا جاتا ہے وہ محض حادثاتی طور پر نہیں بلکہ یہ سب رب العزت کے تخلیقی فعل کے شواہد ہیں اور ان کا مقصد کائنات کی ہر شے اور بحیثیت کل تمام کائنات کی بتدریج تکمیل و ربوبیت ہے''(۱۳)۔

کئی سالوں تک کانگریس کے اجلاس ملک خدا بخش بچہ صاحب کی رہائش گاہ پر منعقد ہوتے رہے۔آخر کار چوہدری مظفر حسین نے ۷۔فرینڈز کالونی ملتان روڈ لاہور پر واقع اپنی وسیع و عریض رہائش گاہ کا ایک حصہ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کے دفتر اور لائبریری کے لیے وقف کر دیا۔

۱۹۶۸ء کے آغاز میں آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس نے ادارے کا ترجمان علمی مجلّہ دوماہی ''Islamic Education'' (اردو۔انگریزی) جاری کیا جس کے پہلے مدیر خود ڈاکٹر محمد رفیع الدین تھے۔انہوں نے خود بھی اس مجلّے کے لیے مقالات لکھے اور دیگر اہل قلم دانشوروں کو بھی اس کے دائرے میں شامل کیا۔بعد میں ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۵ء تک ''اسلامی تعلیم'' اردو مجلّے کے طور پر علیحدہ شائع ہوا جس کے ہر شمارے میں یہ وضاحت بھی شائع ہوتی رہی کہ کانگریس کے تمام تحقیقی، تصنیفی اور انتظامی کام کو منظم کرنے کے لیے دو دوماہی جریدے ''اسلامی تعلیم'' اردو زبان میں اور ''اسلامک ایجوکیشن'' انگریزی زبان میں شائع کیے جاتے ہیں۔ان میں ایسے بلند پایہ معیاری اور تحقیقی مضامین پیش کیے جاتے ہیں جن کا تعلق طبیعات، کیمیا، فلکیات، ارضیات، حجریات، حیاتیات، نباتیات، انفرادی نفسیات، اجتماعی نفسیات، فلسفہ تعلیم، فلسفہ معاشیات، فلسفہ، قانون اور فلسفہ، تاریخ وغیرہ سے ہو۔مضامین و مقالات کا مرکزی نکتہ یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ آفاق و انفس میں جو حیرت انگیز نظم و ضبط اور مقصدیت پائی جاتی ہے اس کا سرچشمہ خدا کی قوت و حکمت اور تدبیر و ربوبیت ہے۔

دوماہی ''اسلامی تعلیم'' اور ''اسلامک ایجوکیشن'' جناب اے۔کے بروہی، سید ظفر الحسن، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، عبدالحمید کمالی، منظور احمد عباسی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، حافظ عباد اللہ فاروقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر خالد علوی، ڈاکٹر محمد ریاض، ڈاکٹر رحیم بخش شاہین، افضال

حسین قادری، پروفیسر محمد منور، کلیم صدیقی، مظفر حسین، ڈاکٹر ابصار احمد اور دوسرے نامور دانشوروں کی علمی و تحقیقی تحریروں سے مزین ہوتے رہے۔

کانگریس کے زیر اہتمام ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے انگریزی مضامین کا ایک مجموعہ" Facts of Islamic world view "،قرآن اور علم جدید اور حکمت اقبال دوسرا ایڈیشن (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے اشتراک سے) شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، سید اللہ بخش، ڈاکٹر رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر محمد ریاض، مظفر حسین اور محمد اکرم خان کی تصانیف بھی شائع ہوئیں۔

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس نے اپنے اغراض و مقاصد سے ہم آہنگ متعدد قومی اور بین الاقوامی اداروں سے قریبی روابط بھی قائم کیے جن میں انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، اسلامک فاؤنڈیشن برائے سائنسی و ٹکنیکی ترقی جدہ، اسلامی سائنسی تعلیمی اور ثقافتی ادارہ رباط(مراکش)، انسٹیٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ واشنگٹن (امریکہ) اور اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے" اسلامی تعلیم "اور" اسلامک ایجوکیشن" کے علاوہ" حکمتِ قرآن" کے نام سے ایک اور ماہنامہ کانگریس کی طرف سے شائع کرنے کے لیے ڈکلریشن حاصل کیا تھا لیکن ان کی وفات کے بعد اس کے چند شمارے ہی شائع ہو سکے اور بعد میں ڈاکٹر اسرار احمد کی درخواست پر" حکمت قرآن" مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی جانب سے باقاعدہ شائع ہونے لگا اور اس کی اشاعت آج تک جاری ہے(۱۴)۔

ازدواجی زندگی:

ڈاکٹر رفیع الدین کی شادی ۱۹۳۹ء میں اپنے ایک قریبی عزیز مولوی ضیاء الدین کی صاحبزادی شریفہ بیگم سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے صلاح الدین محمود اپنی والدہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ صوم وصلوٰۃ کی پابند اورشرعی پردہ کا اہتمام کرتی تھیں۔ اُنہوں نے اپنی زندگی ڈاکٹر صاحب کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی۔ اُن کا انتقال ۲۸ اگست ۱۹۹۳ء

کو کراچی میں ہوا۔ڈاکٹر رفیع الدین کو اللہ نے چار بیٹے اور تین بیٹیاں عطا کیں۔ایک بیٹے صلاح الدین محمود نے اپنے والد، ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی تصنیف" روح اسلام" کا" The Essence of Islam" کے عنوان سے اوردوسری تصنیف" قرآن اور علم جدید" کا" Islam & Modern Knowledge" کے عنوان سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے علمی کام کی نشرواشاعت کے لیے" رفیع الدین فاؤنڈیشن" بھی قائم کی ہے۔ایک دوسرے بیٹے شجاع الدین نے ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد ان کے بارے میں چند مضامین قلمبند کیے تھے جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے ڈاکٹر صاحب کے معمولات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی حادثاتی موت:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی وفات کراچی میں ایک سڑک کے حادثہ میں ہوئی۔اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر وہ اپنی آخری تصنیف" حکمتِ اقبال" مکمل کر چکے تھے۔اس کی اشاعتِ دوم میں چند مزید ابواب کا اضافہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ان میں سے ایک باب کا عنوان انہوں نے" خودی اور موت" طے کرلیا تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنے ایک رفیقِ کار چوہدری مظفر حسین کو کچھ ہدایات بھی دی تھیں۔البتہ وہ اپنے اہل خانہ اور اپنے بعض قریبی دوستوں سے بیان کرتے تھے کہ اب مجھے Inspiration حاصل نہیں ہوتا، شاید دنیا میں میرا کام مکمل ہو چکا ہے(۱۵)۔۱۹۹۶ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد نے آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور کے اشتراک سے" حکمتِ اقبال" کا دوسرا ایڈیشن بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا لیکن اس میں اضافہ کی ڈاکٹر صاحب کی خواہش پوری نہ ہوسکی۔

وہ ۲۸نومبر۱۹۶۹ءکو اپنے صاحبزادے عبدالسلام کی خوش دامن کی وفات پر تعزیت کے لیے کراچی پہنچے۔اگلے روز مورخہ۲۹نومبر کو وہ تعزیت سے فارغ ہوکر اپنی صاحبزادی کے ہاں جانے کے لیے رکشہ میں سوار ہوئے۔ لارنس روڈ پر سامنے سے آنے والی ایک تیز رفتار بس

رکشہ کے ساتھ ٹکرائی۔ اس خوفناک تصادم میں ڈاکٹر صاحب موقع ہی پر جاں بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! وہ بری طرح کچلے گئے۔ان کی جیب میں موجودہ کچھ کاغذات کی مدد سے ان کی شناخت ممکن ہو سکی۔اسی رات ڈاکٹر صاحب کا جسد خاکی پہلے بذریعہ طیارہ لاہور لایا گیا جہاں سے سڑک کے راستے ان کی میت کو سیالکوٹ لے جایا گیا۔مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۶۹ء کو ان کی وصیت کے مطابق انہیں قبرستان حکیم خادم علی (سیالکوٹ) میں اُن کے والد ماجد کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا(۱۶)۔

سیرت و کردار:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی زندگی کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے ، ان کے تعلیمی وتدریسی مراحل کو دیکھا جائے ، ان کی علمی وتحقیقی کاوشوں کو پرکھا جائے ، اور اپنے تعلیمی نظریات کی عملی صورت گری کے لیے انہوں نے جو جدوجہد کی ، اس کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ان کی زندگی ایک ایسے عالم اور معلم کی زندگی تھی جو علم کی تلاش اور جستجو سے عبارت تھی۔ انہوں نے تمام عمر ذاتی مفادات اور خواہشات حتیٰ کہ افراد اور اداروں کی بے جا مخالفت کو بھی اپنے علمی منصوبوں کے راستے میں رکاوٹ بننے نہیں دیا اور زندگی کی آخری سانسوں تک اپنے اعلیٰ آدرشوں اور مقاصد کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی سیرت کا یہ وہ پہلو ہے جس پر دو آراء نہیں ہو سکتیں اور جس کی گواہی ان کے معاصرین نے بھی دی ہے جن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی ، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالحسن ندوی، ڈاکٹر اسرار احمد اور دیگر اصحاب شامل ہیں۔ ملک خدا بخش بُچہ کا شمار ڈاکٹر مرحوم کے انتہائی قریبی رفقا میں ہوتا تھا۔ اُنہوں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تعزیتی کالم میں لکھا:

> ”ڈاکٹر رفیع الدین کی اندوہناک موت سے علمی دنیا میں ایک خلاء پیدا ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب ایک نہایت محقق انتھک اور ٹھوس کام کرنے والے درویش صفت انسان تھے۔ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اسلام اور ملت اسلامیہ پاکستان کی محبت کی ایک شمع روشن کر رکھی تھی جس کا شعلہ یقین

> زندگی بھر ضوبار رہا“(۱۷)۔

ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری چند سالوں میں ان کے بہت قریب رہے۔ اپنے ایک مضمون میں وہ چوہدری مظفر حسین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”ایوب خان کے دور حکومت میں مغربی پاکستان کی حکومت کے ایک اہم وزیر ملک خدا بخش بُچہ نے ان سے کہا کہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرو جو نظام تعلیم کو اسلامی رخ پر تبدیل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو لیکن اس پر جماعت اسلامی کی چھاپ بھی نہ ہو۔ چوہدری صاحب، مولانا مودودی کے نیاز مندوں میں سے تھے۔ اُنہوں نے یہ مسئلہ مولانا مرحوم کے سامنے بیان کیا تو اُن کا کہنا تھا کہ بغیر ایک لمحے کے توقف کے مولانا نے فوراً ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا نام لیا“(۱۸)۔

ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنے علمی کام سے نہ صرف ملک کے اندر ایک احترام کا مقام حاصل کیا بلکہ بیرون ملک بھی ان کے کام کا چرچا ہوا۔ عالم اسلام کی نامور دینی شخصیت، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ڈاکٹر رفیع الدین کی تحریروں سے رہنمائی حاصل کرنے کا اعتراف اس طرح کیا:

> ”۱۹۵۸ء۔ ۱۹۵۹ء میں ہمارے دوست سعید رمضان جو ”المسلمون“ رسالہ دمشق سے نکال رہے تھے ، ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے جرمنی چلے گئے۔ اُنہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ ان کی غیر موجودگی میں ”المسلمون“ کا اداریہ لکھ دیا کروں۔ میں نے کئی مہینے اس کی تعمیل کی۔ اس سلسلہ میں میرا پہلا مضمون ”ردۃ جدیدۃ“ کے عنوان سے تھا جس میں ، میں نے عالم اسلام میں ایک نئے قسم کے ارتداد کی نشاندہی کی۔ یہ وہ ارتداد ہے جو مشرق اسلامی پر یورپ کی سیاسی وتہذیبی تاخت کے پیچھے پیچھے آیا ہے اور سب سے عظیم ارتداد ہے جو عہد رسالت سے لے

کہ آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے ۔ یہ دینی لادینیت ہے جو مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کے بے شمار افراد کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے ...... دراصل اس خیال کی بنیاد اور اس مسئلہ کی طرف توجہ فاضل گرامی ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم کے ایک مضمون سے ہوئی تھی ، میں نے یہ بنیادی تصور لے کر اس کو اسی مضمون میں شرح وبسط کے ساتھ لکھا ''(۱۹)۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے نہ صرف ''معاصرین'' میں ڈاکٹر رفیع الدین کو جگہ دی بلکہ ان کے ساتھ ہونے والی اپنی ملاقات کو بھی ہمیشہ یاد رکھا:

''۱۹۵۵ء میں کراچی میں ملاقات ہوئی اور دل کر بڑا خوش ہوا کہ کم از کم ایک آدمی تو ذہنی اور دماغی قوتوں میں فرنگیوں کا ہم پلہ ہے ۔ اقبال کے بعد یہی ، جو اقبال کے کام اور پیام کو دنیا تک پہنچا سکتا اور اقبال ہی کی زبان اور لہجے میں گفتگو کر سکتا ہے''(۲۰)۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ڈاکٹر رفیع الدین کی تصانیف بالخصوص ''منشور اسلام'' (انگریزی) اور ''قرآن اور علم جدید'' کی اپنے رسالہ ''صدق جدید'' لکھنؤ میں جن الفاظ میں تحسین کی ہے وہ ڈاکٹر رفیع الدین کے ساتھ ان کی وابستگی اور عقیدت کا واضح اظہار ہے(۲۱)۔

چوہدری مظفر حسین، ڈاکٹر رفیع الدین کے بہت قریب رہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو نجی مسائل اور معاملات پر بات کرتے ہوئے بہت کم سنا گیا ۔ دنیاوی خواہشات اور لذتیہ سے دور ہمیشہ اپنی ہی دنیا میں مگن رہے ۔ اپنے چار سالہ تعلقات کے دور میں ، میں نے ان کی زبان سے دنیوی علائق کے بارے میں بہت کم سنا بلکہ مجھے اُن کی زندگی میں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ اُن کے کل کتنے بچے ہیں(۲۲)۔ اُن کے صاحبزادے شجاع الدین بیان کرتے ہیں کہ اپنی تمام زندگی میں انہوں نے اپنے لیے ایک مکان تک نہ بنوایا بلکہ جب ہم ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ یہ ایک ضروری چیز ہے تو آپ کا ایک ہی جواب ہوتا کہ اگر

میں مکان بنوانے لگ جاتا تو یہ کتابیں کون لکھتا ؟ اس ضمن میں ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اقبال اکیڈمی نے آپ کو چھ ماہ کے لیے جرمنی بھیجنا چاہا تاکہ وہاں جا کر لیکچر دے سکیں مگر آپ نے وہاں جانے سے انکار کر دیا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس زمانے میں فلسفہ / تعلیم پر اپنی کتاب ''First Principles of Education'' مکمل کر رہے تھے اور اگر وہ ملک سے باہر چلے جاتے تو یہ کام تاخیر کا شکار ہو جاتا(۲۳)۔

تمام عمر علم کا حصول اور علم کا فروغ ہی اُن کی سب سے بڑی سرگرمی اور سب سے بڑا مقصد رہا۔ اُن کے صاحبزادے شجاع الدین اُن کے معمولات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ انتھک محنت کرتے اور بعض اوقات تو سارا سارا دن ہی دنیا سے بے نیاز لکھتے رہتے اور گھر کے کسی فرد سے بات تک نہ کرتے ۔ امتحانوں کے دنوں میں جب میں رات کو دیر تک جاگ کر تیاری کرتا تو میں دیکھتا کہ اُن کے کمرے کی بتی رات گئے تک جلتی رہتی ہے ۔ وہ آرام وآسائش کے کبھی متمنی نہ رہے ۔ مکان بنوانے یا مال واسباب جمع کرنے سے نہ کبھی اُن کی دلچسپی تھی نہ ہی یہ اُن کا مقصد تھا۔ بچوں کی طرف سے اگر ایسا کوئی تقاضا کیا بھی گیا تو اُن کو سختی سے منع کر دیا (۲۳)۔ صلاح الدین محمود کو آج بھی یاد ہے کہ گھر میں ڈاکٹر صاحب کے لیے کوئی الگ سے Study Room قسم کی کوئی جگہ نہ تھی ۔ وہ چار پائی پر بیٹھ کر لکھنے کے عادی تھے ۔ میں نے انہیں اگر کبھی رات کو بھی دیکھا تو مسلسل لکھتے ہوئے پایا(۲۴)۔ مظفر حسین لکھتے ہیں:

''ایک روز مجھ سے حضرت ابوذرؓ کا ذکر فرما رہے تھے کہ اُن کی موت کا ذکر آ گیا ۔ فرمانے لگے کہ موت کے وقت اُن کی کل جائیداد مٹی کا ایک گھڑا اور لکڑی کا ایک پیالہ تھی جس کی طرف آپؐ کی نگاہ بے قرار بار بار لگ رہی میں لوٹتی اور بڑی پریشانی میں فرماتے ''رسول کریم ﷺ نے اگر یہ پوچھ لیا کہ میرے بعد دنیا میں مصروف ہو گئے تو میرے پاس اس کا کیا جواب ہوگا'' ۔ بڑی مشکل سے یہ واقعہ بیان کر پائے ۔ آواز بار بار گلے میں رندھ جاتی تھی ، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور چہرہ